ابوالفصاحت حضرت جوشؔ ملسیانی

ناشر

ڈائریکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب۔ پٹیالہ

LAUH-O-QALAM (in Urdu)
Josh Malsiani

بھاشا وبھاگ پنجاب

لوح و قلم

جوش ملسیانی

پہلا ایڈیشن : ۱۹۸۹ تعداد کاپیاں :- ۲۰۰۰

قیمت روپے 30=19

ناشر:- راجندر سنگھ ڈائریکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب - پٹیالہ

طابع : کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری ڈیپارٹمنٹ پنجاب۔ چنڈیگڑھ۔

مطبع : سوین پرنٹنگ پریس اڈہ ٹانڈہ جالندھر۔

دیباچہ

جناب جوشؔ ملسیانی کی نثر نگاری اس طرح برجستہ اور جاذب توجہ ہے. جیسے ان کی نظم گوئی۔ نظم کے متعلق تو اُنہوں نے خود فرمایا ہے۔

تم نے زمینِ شعر کو زرخیز کر دیا
جو نخل بو دیا وہی گل ریز کر دیا

اسی طرح ان کی نثر نگاری کا ہر فقرہ لآلئ آبدار کا مجموعہ ہے۔ اسلوب نگارش اس قدر عام فہم اور شستہ ہے کہ قاری کو سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی. خود اُنہوں نے فرمایا ہے۔ گو نظم میں ہے۔

مجھ سے کس بات پہ اُلجھیں گے حریفانِ سخن
میں نے اُلجھا ہوا مضموں کبھی باندھا ہی نہیں

اب آپ ان کی تصنیفات دیکھیئے انہوں نے فن اور انتقاد کے مضمون پر بے شمار لکھا ہے. مشاہیر کے سوانح اور فن کمالات کا ذکر کیا ہے۔ شاگردوں کے کلام کی اصلاحات توضیحات کی ہیں علم عروض کے نکتے جابجا بیان کیئے ہیں. مشاعروں کی دلچسپ روئداد لکھی ہے۔ مشکل اور ادق اشعار کی استادانہ مگر سادہ اور تکلفات سے بے نیاز

شرح کی ہے۔ آپ آئینہ اصلاح کو دیکھئے۔ دیوان غالب کی شرح ملاحظہ فرمائیے ان کا سادہ اسلوب نگارش نمایاں سے نمایاں ہوتا چلا گیا ہے۔ کہیں گنجلک نہیں کہیں کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ قاری کے لیے ان کی نثر نگاری ایک خوش آئند آواز کا کام دیتی ہے۔ زیادہ تفصیل میں اس سلسلے میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے ادبی مضامین ہی اس بات کی پوری ضمانت ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔

والد مرحوم ابوالفصاحت جناب جوش ملسیانی کے کچھ ادبی مضامین ان کے کاغذات سے دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ مضامین زیادہ تر تبصروں مشاعروں کی سرگذشت اور مشاہیر پر تنقید پر مشتمل ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ مضامین کہیں نہ کہیں شائع ہوئے ہوں گے لیکن کتابی صورت میں یہ پہلی بار منظر عام پر آرہے ہیں۔

ناظرین کو ان مضامین سے والد مرحوم کی تنقیدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ میں بھاشا وبھاگ پنجاب سرکار کا بہت شکرگذار ہوں کہ انہوں نے ان مضامین کی اشاعت کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ ان میں سے سب مضامین تقسیم ملک سے پہلے کے ہیں۔

عرش ملسیانی

پیش لفظ

بھارت کی متعدد زبانوں کی پرورش و پرداخت پنجاب کی آغوش میں ہوئی ہے۔ اور ان کے بہترین ادبی شہ پارے اسی سرزمین پر تخلیق کیے گئے ہیں۔ کلاسیکی زبانوں کے علاوہ تین ہندوستانی زبانوں یعنی ہندی پنجابی اور اُردو کی نشوونما بھی اسی علاقے میں ہوئی ہے۔ ان زبانوں کی ادبیات میں جس قدر پنجاب کا حصّہ ہے شاید ہی کسی اور علاقے کا ہو۔ خصوصاً اُردو زبان و ادب کا تو اس خطے سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ پنجاب نے اُردو ادب کو بہترین شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، طنز و مزاح نگار، صحافی، نقاد اور محقق دیے ہیں۔

پنجاب اور اُردو کے اسی گہرے رشتے کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت پنجاب نے ہندی اور پنجابی کی طرح اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے بھی ایک شعبہ الگ طور پر قائم کیا ہے۔ یہ شعبہ جن طریقوں سے اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے ان میں مشاعروں اور اُردو سیمناروں کا انعقاد، اُردو کی مفت تعلیم کے مراکز کا قیام، اُردو کتب کی اشاعت کے لیے معاونت۔ ضرورت مند ادیبوں کے لئے مالی امداد۔ بہترین ادبی تخلیقات اور اعلےٰ طباعت کے لیے انعامات دینے کے علاوہ ایک ادبی جریدے "پرواز ادب" کا اجراء بھی شامل ہے۔

علاوہ ازیں اُردو کے عظیم پنجابی ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعتی

سلسلے میں پنجاب کے مایہ ناز ادیب پنڈت بھورام جوشؔ ملسیانی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ شعری تخلیقات کو یکجا کر کے "کلیاتِ جوشؔ ملسیانی" کے نام سے شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نثری کاوشات کو بھی "لوح و قلم" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد پنجاب کے معیاری ادب کو مناسب قیمت پر قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرنا ہے۔

پنجاب کی اردو شاعری میں حضرت جوشؔ ملسیانی کا جو مقام ہے اس سے کوئی اردو دان ناواقف نہیں مگر بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ جناب جوشؔ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی عظیم نثار بھی تھے۔ خصوصاً فنِ تنقید میں آپ کو کامل دسترس حاصل تھی۔ اصلاحِ سخن بھی آپ کے محبوب موضوعات میں سے تھا۔ نثر میں آپ کی تخلیقات "آئینۂ اصلاح" اور "شرحِ دیوانِ غالب" شائع ہو کر مقبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "لوح و قلم" بھی آپ کے نثر پاروں کا مجموعہ ہے۔ جس میں معروف کتب پر تبصرے، مشاعروں کی روئیداد اور مشاہیرِ ادب کے قلمی خاکے شامل ہیں۔ ان سے اس عظیم ادیب کی انشاء پردازی اور تنقیدی شعور کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

محکمہ جناب عرشؔ ملسیانی کا بے حد ممنون ہے۔ جن کے پُرخلوص تعاون کی بدولت یہ کتاب اشاعت پذیر ہو سکی۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جناب طارق کفایت اللہ اور ان کی نگرانی کرتے ہوئے جناب اوم پرکاش آنند ایڈیٹر اردو نے جس جانفشانی سے کام کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

:

پنجاب کے اس عظیم سپوت ادیب کے غیر مطبوعہ نثری مجموعے کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوا محکمہ فخر محسوس کرتا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ قارئین کی جانب سے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

راجندر سنگھ

ڈائریکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب۔

منظوم کتابوں پر تبصرہ

مشاعرے

بعض مشاہیر شعرائے اُردو

کارنامۂ غم

جناب احسنؔ مارہروی مرحوم نے اپنے مذہبی خیالات اور اس راسخ الاعتقادی کو جس کی روشنی میں انہوں نے اپنی عمر عزیز بسر کی اور جس کی برکت سے انہیں بہت سا روحانی فیض بھی حاصل ہوتا رہا اور جسے وہ وقتاً فوقتاً منظوم بھی فرماتے رہے۔ اپنی وفات سے تقریباً دو سال پہلے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ کارنامہ غم اسی مجموعہ افکار کا تاریخی نام ہے۔ جس سے سن ۱۳۵۰ ہجری متخرج ہوتا ہے۔

اصناف سخن کے لحاظ سے اس مجموعۂ کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصّے میں رباعیات ہیں، دوسرے میں سلام اور تیسرے حصّے میں متعدد خمسے اور تضمین ہیں۔ آخر میں خدمت مخلوق کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ موضوع سخن کے لحاظ سے یہ نظم بھی اسی مجموعۂ کلام کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

پیشتر اس سے کہ کسی مذہبی تصنیف پر کوئی تبصرہ ضبط تحریر میں لایا جائے یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ عام مذہبی نظموں کی تصنیف شاعر کا میدان خیال غزل کی طرح لا متناہی و غیر محدود نہیں ہوتا اور سلسلہ کلام اگر واقعات کربلا ہی سے مختص ہوں تو یہ میدان

اور بھی تنگ تر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پابندی اور بھی دشواری پیدا کرتی ہے کہ بزرگانِ دین کی شان میں ادب اور احترام کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور اس مجبوری کی وجہ سے ذخیرہ الفاظ کی فراوانی بھی قوتِ بیان کی مدد کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ غزل اور سلام کا مقابلہ کرتے وقت ان مشکلات کو نظر انداز کر دینا سراسر ناانصافی ہے۔

کسی شاعر کا سلام بہ لحاظ خوبی کلام اگر اس کی غزل کا ہم پایہ و ہم پلّہ ہو تو ان مشکلات اور پابندیوں کی وجہ سے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ سلام بہ مقابلہ غزل زیادہ تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔ اسی امتیازی وصف سے کسی شاعر کی قادر الکلامی و کمال شاعری پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ رباعیات کی تنقید میں بھی یہی نظریہ قابل لحاظ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عام قسم کی رباعی کے لیے تلاش مضمون کی زحمت کسی خاص حد تک محدود نہیں ہوتی۔

احسنؔ مرحوم اپنے ذوقِ سخن و کمال فن کو صرف غزل گوئی تک محدود نہ رکھتے تھے۔ ان کے ذخیرہ کلام میں ایسے مضامین بھی کثرت سے ہیں جنہیں ملک و ملت کے لیے درس آموز و بصیرت افروز کہنا چاہیے۔ مثلاً انہوں نے ایک رباعی میں ذوق سخن کا صحیح استعمال اس طرح بیان فرمایا ہے۔

احسنؔ نہ کبھی زمانہ سازی کیجیے
بمثلِ شعراء نہ شعر بازی کیجیے
ہے ذوقِ سخن اگر تو صدقِ دل سے
مداحیِ سلطانِ حجازی کیجیے

جو شاعری صرف نوجوانوں کے شبابی جذبات کو خوش کرنے کے لیے ہو اور جس میں عریانی مضامین کی فراوانی دانستہ پیدا کی گئی ہو اسے زمانہ سازی بلکہ شعر بازی سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ استہزائے ان کے میلان ضبعیت کا پتہ دیتا ہے۔ تیسرے میں ذوق سخن کے صحیح صرف پر توجہ دلانے کے لئے صدق دل پر بھی اصرار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ سے یہ ہدایت اتنی غیر مشروط ہو گئی ہے کہ کوئی استثنا باقی نہیں رہا اور اس پر کرنے کے لیے اس سے زیادہ تاکید دوسرے الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ چوتھے مصرعہ میں لفظ مداح، بالکل استادانہ ہے۔ یہاں تعریف یا توصیف بھی آسکتا ہے۔ مگر یہ صیغۂ مبالغہ کے مدح کی وسعت انتہا تک پہنچا دی ہے۔

رباعیات کی تعداد اس مجموعہ میں ۳۶ ہے۔ ان میں متعدد رباعیات ایسی ہیں جنہیں حسن سخن کی جان اور خوش بیانی کا ایمان کہنا چاہیے۔ مثلاً۔

کی الفتِ پنج تن ہمارے جی نے ۔ معمور ہیں نور جس سے اپنے سینے
احمد حیدر بتول شبّر و شبیر ۔ ہیں منزلِ واحد کے یاں پانچوں زینے

مصرع اول میں قافیہ معمول کی خوبی ملاحظہ ہو۔ باقی دونوں قوافی بھی بہت دلچسپ بلکہ ناطق ہیں۔ پنجتن اسلامی زبان میں اتنا معروف لفظ ہے کہ محتاجِ تفصیل نہیں۔ مگر پھر بھی مصنف نے تیسرے مصرع میں تفصیل کی مشکلات میں پڑنا منظور کیا۔ وزن بحر صحت لفظی کی پابندیوں سے مختلف نام شعر یا مصرع میں لانا

بڑا مشکل کام ہے۔ اور رباعی کے وزن میں یہ مشکل اور بھی قافیہ تنگ کرتی ہے۔ پھر ان کا اسماء کو ایک خاص ترتیب سے بیان کرنے میں اگر کوئی شاعر کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے اعجاز بیان کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ احمد حیدر بتول شبیر شبرؑ حفظ مراتب کے لحاظ سے یہ ترتیب قابل غور ہے۔ وزن پورا کرنے کے لیے حرف عطف کی ضرورت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ حیرت کا مقام ہے کہ یہ مصرع اس شان کا کیوں مرتب ہوا۔ چوتھے مصرع میں پانچوں کے لحاظ سے اسماء الٰہی میں سے واحد لفظ کو منتخب کرنا کیا لطف پیدا کر رہا ہے۔ اس رباعی کو پڑھ کر مندرجہ ذیل رباعی کا چوتھا مصرع خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں اور بالکل بجا فرماتے ہیں۔

سبطین کا وابستۂ دامن ہوں میں ۔ کونین کے فکر و غم سے ایمن ہوں میں
وصفِ حسن و حسین پڑھ کر سر بزم ۔ احسنت نہ کیوں سنوں کہ احسن ہوں میں

ظالم کا نام تک باقی نہیں رہتا اور نیک آدمی اپنی نیکی کی وجہ سے زندہ رہتا ہے۔ اس مضمون کو سعدی نے بھی اس طرح بیان کیا ہے۔

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نہ مرد کہ نامِ نکو گذاشت

جناب احسنؔ نے بھی یہی مضمون ایک جگہ سپردِ قلم کیا ہے مگر ملاحظہ ہو یہ پامال مضمون زور بیان سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

لیتا ہے شقی کا نام کب کوئی ہیں ۔ نیکی لقب نیک ہے ہر دل میں مکیں
ہے نام بد و نیک کی نسبت کا یہ فرق ۔ لاکھوں ہیں حسین اور یزید ایک نہیں

"لاکھوں ہیں حسین اور یزید ایک نہیں" اللہ اللہ یہ مصرع کس زور کا ہے۔ اچھے اور بُرے نام کی نسبت کا فرق اس سے زیادہ کوئی کیا بیان کر سکے گا۔ پیش پا افتادہ واقعات سے اتنا بلند پایہ نتیجہ استخراج کرنا معمولی دماغ کا کام نہیں۔

دل شاد کیا روح کو ناشاد کیا ۔۔۔ دُنیا کے لیے دین کو برباد کیا
امّت نے امام کو مٹا کر گویا ۔۔۔ مسجد کو تباہ گھر کو آباد کیا

دوسرا مصرع پہلے مصرع کے مضمون کو واضح کرنے کے لیے ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی "مسجد کو تباہ کرکے گھر کو آباد کرنا" اس سے زیادہ اور شقاوت کیا ہوگی۔ امام کی نسبت مسجد کا ذکر محتاج توصیف نہیں۔

عادی جو نہیں زیادہ خوش ہونے کے
اوقات عزیز وہ نہیں کھونے کے

عاشور و عیدین سے ثابت ہے یہ بات
دو دن ہنسنے کے ہیں تو دس دن رونے کے

دوسرے مصرع میں ردیف بے معنی فعل مستقبل کتنی شگفتہ ہے۔ ذوق کا یہ مصرع مشہور ہے۔ ؎

اگر ہے عید کا اِک دن تو عشرہ ہے محرّم کا

مگر حق یہ ہے کہ عید کا ایک دن نہیں۔ بلکہ دو دن ہوتے ہیں۔ جناب احسن نے لفظ عیدین لاکر ہنسنے کے دو دن ارشاد فرمائے۔ یہ قول روزمرہ کے مطابق بھی ہے اور "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے مصداق حال بھی۔

اس مختصر اقتباس سے ظاہر ہے کہ میدان تحسین تنگ تر ہونے
کے باوجود احسنؔ مرحوم کی رباعیات کتنی امتیازی حیثیت کی ہیں۔ اور
وہ اس صنف پر کتنے قادر ہیں۔ مزید اقتباس کا خیال باعث طوالت
سمجھ کر کتاب کا دوسرا حصّہ جو سلام کی صنف سے تعلق رکھتا ہے
زیر بحث لایا جاتا ہے۔ سلاموں کی تعداد اس مجموعہ میں ۱۶ ہے۔
ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی زمینیں بھی دشوار گذار ہیں۔
مثلاً بھلا پسند کرے، رضا پسند کرے یا امام سے پہلے، سلام
سے پہلے یا کفن سے چلا، ذہن سے چلا وغیرہ۔ تراوش خیال کاوش فکر
کا صحیح اندازہ کرنے کے لیئے دونوں قسم کی زمینوں کا کچھ انتخاب
اب یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دل میں بھری ہوئی ہے اُلفت حسینؑ
پیتا ہوں جام ساقیِ کوثرؓ کے نام کا

کنبہ ہوا تباہ مگر اف نہ کی ذرا
کیا صبر کیا جگر تھا جنابِ امام کا

حضرت پھرے جد مصر کو مڑا ذوالجناح بھی
ایسا فرس نہیں کوئی سچا لگام تھا

تین اشعار صفائی بیان و لطف زبان کے لحاظ سے بے مثل
ہیں۔ لگام کا قافیہ اس زمین میں آسان نہ تھا مگر ایسی خوبی سے
بندھا ہے کہ لطف زبان خود داد لینے پر مجبور ہے۔

صورت یہ بیکسی نے بنائی حسینؑ کی
گویا نہ تھی خدا کی خدائی حسینؑ کی

دُنیا نے کی یہ قدر فزائی حسینؓ کی
اُمڈی ہے کربلا میں کمائی حسینؓ کی

ہر دو مطلع مطلع آفتاب ہیں۔ اسلوب بیان اتنا دردناک ہے کہ دشمن کا کلیجہ بھی پھل جاتا ہے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں جسے تصنع و آورد میں شامل سمجھا جائے۔ ہموار بیانی اور بے ساختگی میں اتنا زور کلام پیدا کرنا آسان نہیں۔ قدر فزائی میں ہجو ملیح اور کمائی میں لطف زبان کے ساتھ ساتھ وسعت مفہوم قابل غور ہے۔ اس زمین میں تمام اشعار اسی رنگ اور اسی پائے کے ارشاد ہوئے ہیں۔ مثلاً۔

بے درد ظالموں نے نہ پوچھا تو کیا ہوا ۔ میت ملائکہ کی اٹھائی حسینؓ کی
ہر چند کربلا کا سفر تھا بلائے جان ۔ فرقت مگر بہن کو نہ بھائی حسینؓ کی
وقت وغا یہ حضرت زینب کی تھی دُعا ۔ اللہ خیر ہو مرے بھائی حسینؓ کی

پہلے شعر کا مصرع ثانی بہ لحاظ زور کلام کتنا بے پناہ ہے۔ "نہ پوچھنے کا ردعمل" اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ دوسرے شعر کا قافیہ اس لحاظ سے کہ برادر کے معنی بھی رکھتا ہے۔ نور علیٰ نور ہے۔ اس کا لطف الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ بعض فصحا نے مصدر بھانا کو متروک قرار دیا ہے۔ مگر یہ پہلا قافیہ عملی الاعلان کہہ رہا ہے کہ اس شعر کو اسی مصدر کے ساتھ ہنرمندانہ استعمال نے یہ شان عطا کی ہے۔ تیسرے شعر میں قافیہ اور ردیف کا باہمی ربط کتنا خوبصورت ہے۔

کیا پوچھتا ہے تو تی کہ محرم میں کیا ہوا
گھر تھا کربلا میں ذبح شبیہ کربلا ہوا

یہ حشر کربلا کی زمیں میں بپا ہوا
بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا جدا ہوا

ہر دو مطلع اپنے رنگ میں فرد ہیں۔ کربلا کے دو اجزاء "کرب" اور "بلا" کی تجزی کس جدت سے کی ہے۔ دوسرا مطلع پڑھ کر انیس کا رنگ سخن یاد آتا ہے۔ مصرع ثانی کے بعد مصرع اول میں لفظ "حشر" کی قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

نہ چھوڑی آن لیکن جان دے دی راہ مولا میں
اسی کا نام مذہب ہے اسی نام ایماں ہے

تپش دیکھو عطش دیکھو پھر اس پر یہ عمل دیکھو
کہ شکوے کے عوض حضرت کے لب پہ شکر یزداں ہے

عجیب و غریب ترکیبوں سے شعر کو گورکھ دھندا بنا دینے والے شعراء اس سادگی بیان اور زور قلم سے عبرت حاصل کریں۔

انقلاب آہ زمانے میں ہوا ہے کیسا
تشنہ لب ہیں مئے کوثر کو پلانے والے

ہائے کس درد سے عابد نے کہا اکبر سے
ہم رہے جاتے ہیں او چھوڑ کے جانے والے

کہا نکہت زلف اکبر نے رن میں
یہ جنگل ہمارے لبائے ہوئے ہیں

کہا شہ نے اعداء کو چو رنگ کر کے
یہ پشتے ہمارے لگائے ہوئے ہیں

نہ پوچھو حضرت شبیر کو صدمے ہوئے کیا کیا
لٹا گھر بھی چھٹا در بھی اٹھا شر بھی کیا سر بھی

ہوئیں سب آہ غم شبر بے والی و وارث
بہو بھی زوج بھی ہمشیر بھی بھاوج بھی دختر بھی

بلائے کربلا میں مبتلا تھے ساتھ حضرت کے
بھتیجے بھی پسر بھی بھانجے بھی اور برادر بھی

اہل ذوق اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا اشعار خوش بیانی و تر زبانی کے لحاظ سے کس پایہ کے اور سلام کے رنگ میں کتنی داد کے

مستحق ہیں۔ حسن بیان کی وہ کون سی خوبی ہے۔ جو ان میں نہیں۔ اگرچہ یہ مختصر انتخاب جناب احسنؔ کی تراوش فکر کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ مگر ان مشکل زمینوں کی بھی سیر کیجیے اور کاوش فکر کی کامیابی دیکھیے۔ جن میں مرد میدان ہی شہہ سواری کے جوہر دکھا سکتا ہے اور اپنی خوش بیانی کا سکہ بٹھا سکتا ہے۔

درود بھیج رہا ہوں سلام سے پہلے
نبی کا نام ہے لب پر امام سے پہلے

پڑھا حسین علیہ السلام سے پہلے
رضائے حق کا سبق امت محمد نے

تمام کی تھی حجت تمام سے پہلے
دغا کا قصد کیا بعد شہ دیں نے

اس زمین کو دیکھیے۔ میدان تخیل کی تنگ دامانی کے باوجود ان اشعار کی شان اور رفعت کا اندازہ کیجیے۔ مطلع کس شان کا ہے۔ اس کی داد کہاں تک دی جائے۔ انتہا کی چستی بندش بے تکلفانہ آمد جچے تلے الفاظ بولتے ہوئے قوافی ردیف کی نشست کوئی نقطہ کسی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔ اس مرصع کاری بلکہ نادر کاری کے باوجود حفظ مراتب کی معنوی خوبی اور درود و سلام کا مکمل صرف و نحوی فرق غرض کس کس چیز کی داد دی جائے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں قوافی کا حسن اور ردیف کے استعمال کا دوسرا پہلو بھی قابل ملاحظہ ہے تیسرے شعر کا مصرع ثانی بالکل الہامی حیثیت کا ہے۔ یہ قافیہ اس زمین میں اجنبی تھا مگر محاورہ کی خوبی کے ساتھ مل کر خود بھی خوب و مرغوب ہو گیا ہے۔

کریں گے اہل ہوس قدر کیا قناعت کی
وہ جھٹ تو لیں طمع زر کے دام سے پہلے

اٹھائیں گرز نہ اعدا، یہ کہتے تھے شبّیر
وہ بچ تو لیں میری ضرب حسام سے پہلے

ہوئے اصول سے غافل فروع میں اُلجھے
یہ کی خواص نے بدعت عوام سے پہلے

حلال ہونے کو وہ کربلا میں جاتے ہیں
نہ نکلے جو کبھی بیت الحرام سے پہلے

سبحان اللہ طبیعت کیا ہے۔ ایک دریا بہہ رہا ہے۔ جو اس دشوار گذار زمین میں مواج نظر آتا ہے۔ پہلے اور دوسرے شعر کے مصرع ہائے ثانی ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ دام کس ہنرمندی سے بچایا گیا ہے ضرب حسام کس زور کی ہے۔ تیسرے شعر میں اصول و فروع خواص و عوام یہ الفاظ نہیں نگینے ہیں۔ چوتھے شعر میں حلال و حرام کا تقابل۔ کتنا دل نشین ہے۔ حلال ہونے کو جاتے ہیں۔ اس کے معنوی اشتداد کا کیا ٹھکانا۔

جو دل کہ مدح شہہ کربلا پسند کرے
کچھ اور بات بھی اس کی بلا پسند کرے

عدوئے عابد بیمار تندرست نہ ہو
وہ سم ہو اس کے لئے جو دوا پسند کرے

وہ بوالہوس ہے ہوس نہیں ہے جو احمق
بجائے خاک شفا کیمیا پسند کرے

دہانِ تیغ بھی تشنہ کام مثل حسین
نہ کیوں وہ خونِ سر اشقیا پسند کرے

رفیق و دشمنِ حیدر کے استخواں میں ہے فرق
یہ سگ قبول کرے وہ ہما پسند کرے

مطلع میں کربلا اور بلا کے قوافی پر اس وجہ سے کہ کربلا بھی دراصل کرب و بلا ہے۔ کوئی ناواقف معترض نہ ہو مگر حق یہ کہ کربلا ایک خاص مقام کا نام ہونے کی وجہ سے الفاظ تجزیہ کو خارج

از بحث بنا دیتا ہے۔ نیز مصرع ثانی میں لفظ بلا مہند اور مجازی اس صورت میں ہے۔ حقیقی نہیں اس لیے ایطا نہیں کہا جا سکتا۔ اس مجازی رنگ میں قافیہ کی شگفتگی اور برجستگی بلا شبہ قابل داد ہے۔ علاوہ مصرع ثانی کی روانی و بے تکلفی بھی قابل دید ہے۔ دوسرے اس کے شعر میں یہ دعا کہ وہ تندرست نہ بیمار کی نسبت کتنی نادار ہے اس جدّت بیان کا کیا کہنا تیسرے شعر میں بوالہوس تہوس خاک کیمیا ان متناسب الفاظ کا اہتمام ملاحظہ ہو۔ مہوس اور بوالہوس کا لطف قابل توجہ ہے چوتھے شعر میں دل کا تیغ کا تشنہ کام ہونا معمولی بات تھی مگر یہ کہنا کہ وہ مثل حسین تشنہ کام تھی زور بیان کی انتہا ہے۔ آخری شعر میں ہما کا قافیہ آسان نہ تھا مگر تلاش مضمون کی کامیابی دیکھیے اور اس مضمون کے ساتھ اس قافیہ کا ربط ملاحظہ کیجیے۔

٭ ٭ ٭

دو سلام ایسے ہیں جو مسلسل ہیں۔ دو تین شعر کا قطعہ تو غزل یا سلام میں بیشتر پایا جاتا ہے۔ مگر پوری غزل یا سلام کو ردیف و قافیہ کا التزام مسلسل کہنے میں بہت مانع ہوتا ہے۔ جناب احسن کے دونوں سلام ان مشکلات کے باوجود کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک سلام تو ایسا ہے جس میں تعداد اشعار تیس سے بھی زیادہ ہے۔ اتنی تعداد میں مسلسل اشعار ہم قافیہ و ہم ردیف رکھ کر کہنا آسان نہیں۔

تیسرے حصّے میں متعدد خمسے زینت اشاعت کیے گئے ہیں۔ حضرت داغ مرحوم کے ایک سلام کی تخمیس کے بعض بند ملاحظہ

ہیں۔ سلام کا ایک مطلع یہ تھا۔

رن میں جب پہنچے نہ تا آلِ پیغمبر پانی
عرق شرم میں کیوں کر نہ رہے تر پانی

پانی کی ردیف کو جتنا ربط سلام سے ہو سکتا ہے۔ غزل سے نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ردیف میں شعراء نے جو غزلیات کہی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس ردیف کے سلام اعجاز کلام کے لحاظ سے زیادہ زوردار بلکہ معرکتہ آلا ہیں۔ اسی ردیف میں حضرت جلیل مانک پوری کا سلام جس کا مطلع یہ ہے۔

ہائے شبیر نہ پائیں لبِ دریا پانی
بات ایسی ہے کہ ہوتا ہے کلیجا پانی

بلاشبہ اُردو شاعری کا سرمایہ فخر و مباہات ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ موصوف اسی زمین میں اگر غزل فرماتے تو وہ اس معصوم کی ہرگز نہ ہو سکتی۔ جناب داغ کا مطلع مذکورہ الصدر معنی آفرینی اور نزاکت خیال کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ اب اس کی تخمیس بھی ملاحظہ ہو۔

سختیاں دیکھ سکے ہائے یہ کیوں کر پانی
اک بشر بند کرے ایک بشر کا پانی
آبرودار ہے ہرگز نہیں ہمسر پانی
رن میں جب پہنچے نہ تا آلِ پیمبر پانی
عرق شرم میں کیوں کر نہ رہے تر پانی

اللہ اللہ کس ٹھاٹھ کے مصرعے لگائے ہیں کوئی مصرع ایسا نہیں جو اپنی شان میں دوسرے کا مدمقابل نہ ہو۔ جس سخن کے کرشمے ہر مصرع میں دامن دل کو کھینچ کر کہتے ہیں کہ جا اینجا است۔ اصل

شعر سے جو ربط پیدا کیا گیا ہے اس کا کیا کہنا تخمیس میں بھی نکتہ سب سے زیادہ قابل لحاظ ہوتا ہے۔ عرقِ شرم میں تر رہنے کی جدوجہد حضرت داغؔ نے ارشاد فرمائی ہے۔ اس کی تائید میں یہ کہنا کہ پانی آبرو دار ہے۔ پتھر تو نہیں کہ اس پر جور و تشدد کا اثر نہ ہو۔ ربط کلام کی انتہا ہے۔

بولی تقدیر پلاؤ گے کسے لے جا کر
چلے عباس جو مشکیزے میں بھر کر پانی

اس شعر کی تخمیس بھی ملاحظہ ہو۔

خشک لب دیکھ کے معصوموں کے با دیدۂ تر
مشک لے کر اٹھے عباس گئے دریا پر
پانی بھرنے سے جو فارغ ہوئے وہ نام آور
بولی تقدیر پلاؤ گے کسے لے جا کر پانی
چلے عباس جو مشکیزے میں بھر کر پانی

ہر دو مصرعوں کی تنگ دامانی کی وجہ سے روایت کے بیان میں جو کمی رہ گئی تھی۔ جناب احسنؔ نے اس کمی کو ایسی ہنرمندی سے پورا کیا ہے کہ اصل شعر کو بالکل چھین لیا ہے۔ 'بولی تقدیر' ان الفاظ کے ساتھ تیسرے مصرعے کو جو ربط ہے اس کی تعریف محتاج بیان نہیں لب خشک و دیدۂ تر کا تقابل بھی قابل دید ہے۔

شاہ کی تشنہ لبی یاد جو آئی اس وقت
پھینکا عباس نے چلو میں اٹھا کر پانی

اس شعر کو اپنانے کی خوبی ملاحظہ ہو۔

مشک عباس نے بھر کر جو اٹھائی اس وقت
شکل انہیں یاس سے حسرت نے دکھائی اس وقت
اور تو بات ہر اک دل سے بھلائی اس وقت
شاہ کی تشنہ لبی یاد جو آئی اس وقت
پھینکا عباس نے چلو میں اٹھا کر پانی

اس زمین میں ایک تو قوافی کو ایطا سے بچانا لازم تھا دوسرے ردیف کا اختصار بھی محال تھا۔ ان مزید پابندیوں کی وجہ سے تینوں مصرعے رواں اور ہموار کہے ہیں۔ تخمیس میں تیسرا مصرعہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصل شعر سے ربط پیدا کرنے کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ اس بند میں بالکل بے ساختہ نظر آتا ہے۔ ربطِ کلام کے لحاظ سے یہ بند بھی مرصع ہے۔

آبرو خاک ہو دُنیا میں تری نہرِ فرات
آلِ احمد کو دیا تو نے نہ بڑھ کر پانی

خمسے عموماً مشاہیر کے کلام پر کہے جاتے ہیں۔ اور اس کام کے لیے مشاہیر کی صرف وہ چیزیں انتخاب کی جاتی ہیں جو ان کے سرمایہ سخن میں بہت ہی گراں قدر اور بہترین ہوں اس قسم کے کلام کا ہم پلّہ کلام کہنا اور ان کا نام و شہ بازوں کی پرواز تک پہنچنا معمولی کام نہیں۔ اس شعر کی تخمیس سبحان اللہ کتنی نورٌ علیٰ نور ہے۔

دیکھ کر تشنہ دہانیٔ شہِ نیک صفات
قدم اپنے نہ بڑھائے گئے تجھ سے ہیہات
تو نے مٹی میں ملا دی ہے خود اپنی اوقات
آبرو خاک ہو دُنیا میں تری نہرِ فرات
آلِ احمد کو دیا تو نے نہ بڑھ کر پانی

آلِ احمد کے تعلق سے مصرعہ اوّل اور 'بڑھ کر' کے تعلق سے مصرعہ ثانی کتنا مربوط ہے۔ تیسرے مصرعہ میں محاورے کا جو لطف ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی خوبی وجدانی ہے۔ یہ مصرعہ بالکل ایسا ہی کہنا چاہیئے۔ بیان کی یہ صفائی زبان کی یہ حلاوت اور اصل شعر کے

الفاظ سے اتنا ربط غرض کس کس چیز کی داد دی جائے۔

اس تخمیس کے بعد حضرت داغؔ کی دو غزلیات پر خمسے شامل اشاعت ہیں۔ یہ دونوں خمسے اس کتاب میں بلاشبہ جناب احسنؔ کی شاہکار اور نوادر افکار میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ سلام پر خمسہ کچھ اور بات ہے اور غزل پر سلامی رنگ میں خمسہ کچھ اور چیز ہے۔ غزل کے مضامین کو سلامی سانچے میں ڈھالنا اور اس کے اشعار کو واقعات کو بلا سے ربط دینا فی الواقع بہت دشوار ہے۔ جو چابک رفتار اس منزل کو کامیابی سے طے سکتا ہے۔ اس کی ہنرمندی اور شاعرانہ کمال سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جناب احسنؔ نے اس ہنرمندی کے لیے غزل بھی وہ منتخب کی جس میں سلامی رنگ کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

لذتِ سیر دگر چشم تمنا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

اگرچہ اس غزل کے بعض اشعار سلامی رنگ میں کسی طرح نہ آسکنے کی وجہ سے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مشہور شعر اس تخمیس میں شامل نہیں۔

چین سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شبِ ہجر بلا ہے کہ مجھے کھا لے گی

مگر انصاف یہ ہے کہ ایسے اشعار علیحدہ کر دینے کے سوا چارہ بھی نہ تھا اس قسم کی زمین ہو اور پھر اشعار غزل کے ہوں اور غزل بھی حضرت داغؔ کی ہو جس میں عاشقانہ نوک جھونک اور معاملہ بندی کے مضامین کی فراوانی لازمی امر ہے۔ پھر بھی

آٹھ اشعار سلامی رنگ کی تخمیس میں منسلک ہو جائیں یہ کوئی معمولی شاہکار نہیں۔ ان مشکلات اور اس مہم کو صحیح طور پر وہی سمجھ سکتا ہے جو اس مصیبت میں مبتلا ہونے کی نادانی کا مرتکب ہو چکا ہو۔

اب اس غزل کے مطلع مذکورہ بالا کی تخمیس پیش کی جاتی ہے

ہمت صبر حسین آج نہ بدلہ لے گی
بلکہ معیار عوض اور بھی بڑھوا لے گی

ہاں مگر حشر میں جب خلق خدا آئے گی
لذت سیر دگر چشم تمنا لے گی

ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

جناب داغ آج زندہ ہوتے تو اس مطلع کی اس تخمیس پر جس میں غزل کی دنیا بھی بدل گئی ہے صد مرحبا کہتے۔ تسلسل کلام کے لحاظ سے اب یہ پانچوں مصرعے ایک ہی رشتہ میں اس طرح منسلک ہیں کہ جوڑ کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ معنوی لحاظ سے مطلع کے مفہوم میں جو انقلاب آگیا ہے۔ اس پر تمام اہل ذوق و سخن شناس انگشت بدنداں ہوں گے۔

شکوۂ دہر نہ بیداد فلک کی فریاد
حشر میں خلق خدا نام تمہارا لے گی

تخمیس ملحوظ ہو۔

سیط احمد کے معاند تھے بڑے زشت نہاد
ان کے اغوا ہی سے پھیلا تھا یہ سب

ظالموں سے کوئی کہہ دے یہ ہمکو ہے یاد
شکوہ دہر نہ بیداد فلک کی فریاد

حشر میں خلق خدا نام تمہارا لے گی

حضرت داغ نے صرف ایک ظالم کو مخاطب کیا تھا۔ جناب احسن نے بہت سے ظالموں کو مخاطب کیا ہے۔ مفہوم میں صرف اتنا فرق قائم کر کے شعر کو کس آسانی سے اپنے رنگ میں لے آئے ہیں۔ یہ تم کو یاد رہے۔

اس ٹکڑے نے مصرعہ ثانی میں جو لطف پیدا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

خاص بخشو گے تمہیں اپنے گناہ گاروں کو
بخشش عام نہ ان کا کبھی ٹھیکہ لے گی

اس زمین میں یہ قافیہ حضرت داغؔ ہی کا حصّہ تھا۔ تخمیس میں جناب احسنؔ نے کس صفائی سے یہ قافیہ چھینا ہے۔

کیا بھروسہ شہہِ کونین پہ تھا یاروں کو یہی کہتے سُنا حضرت کے وفاداروں کو
پوچھتا اور کہاں ہے کوئی غم خواروں کو خاص بخشو گے تمہیں اپنے گناہ گاروں کو
بخشش عام نہ ان کا کبھی ٹھیکا لے گی

اس شعر میں خدا کی رحمت خاص پر بھروسہ کیا گیا تھا۔ مصنف نے اس اعتماد کو شہہِ کونین کی طرف منتقل و منسوب فرما کر تخمیس کی مشکل کس آسانی سے حل کر لی۔

کام بگڑا نہ بنانے سے بنے گا ہرگز
میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلہ لے گی

اس شعر کی تخمیس حسب ذیل ہے۔

شاہ کہتے تھے نہ گھبرائے گا بندہ ہرگز چھوڑے گا شیوہ نہ تسلیم و رضا کا ہرگز
حکم جو حق ہے وہ ٹل نہیں سکتا ہرگز کام بگڑا نہ بنانے سے بنے گا ہرگز
مری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لے گی

جناب احسنؔ یہاں بھی حضرتِ شبّیر کے میدانِ کربلا کی طرف سفر کرنے کے عزم کو اپنے مصرعوں کی شان نزول قرار دے کر غزل کے شعر کو کس صفائی اور سہولت سے سلامی رنگ میں لے آئے ہیں۔ ہر

ایک بند میں یہی ہنرمندی مقدم ہو کر سامنے آتی ہے اور چشم تماشا اس کمال پر اتنی محو حیرت ہو جاتی ہے کہ بند کی دوسری خوبیوں پر توجہ بھی مبذول نہیں ہوتی۔

حضرت داغؔ کی دوسری غزل کا مطلع یہ ہے۔

سوز گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہوں

ایک تو مطلع اتنا لاجواب دوسرے اس میں صاف طور پر عشق کا مضمون اسے سلامی رنگ میں لانے کی مشکل اہل ہنر ہی سمجھ سکتے ہیں کس خوبی سے یہ مشکل حل کی گئی ہے۔

فرماتے تھے حسین کہ آفت رسیدہ ہوں ۔ جب سے حسن شہید ہوئے ہیں جریدہ ہوں
پوچھے نہ کوئی مجھ سے کہ میں کیوں کبیدہ ہوں ۔ سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہوں

سبحان اللہ یہ تخمیس نہیں ہے۔ سحر بیانی ہے یا اعجاز کلام۔ قوافی کی چستی اور نشست کا کیا کہنا۔ تینوں مصرعوں کی روانی بھی اس بند میں دیکھنے کی چیز ہے۔ فرماتے تھے۔ اس تعظیمی لفظ کی گنجائش بھی نکل آئی۔ پانچوں مصرعوں کا باہمی ربط بلکہ دست و گریباں ہونا کس قدر حیرت انگیز ہے۔

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دست تمنا بریدہ ہوں

غزل کا یہ شعر پڑھ کر کس کو خیال آسکتا ہے کہ غزل گوئی کا یہ مخصوص رنگ مخصوص انداز سلامی تخمیس کی صلاحیت بھی رکھتا ہے لفظ چھیڑ چھاڑ اس صلاحیت میں اور بھی مخل ہے مگر ملاحظہ

ہو تخمیس کس ہنرمندی سے کی گئی ہے۔

آیامِ ہجر حضرتِ اصغر کو تھے پہاڑ ہوتی جو دل میں حسرت و ارماں کی بھیڑ بھاڑ
دل تھا مگر یہ کہتی تھیں کھا کھا کے وہ پچھاڑ اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ

ہیں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں

پانچویں مصرعے کے الفاظ تذکیر و تانیث دونوں پر حاوی تھے۔ مصرعے کی زبان کے اس پہلو نے حضرت احسنؔ کو پوری امداد دی ہے۔ نوانی میں محاورہ زبان کا لطف ہر جگہ موجود ہے۔ دل تھا یہ ٹکڑا اس بلا کا ہے۔ اسی تخمیس کا ایک بند اور ملاحظہ ہو۔

سر کاٹ کر حسینؑ کا جب سے چلے عدو وہ سر تلاش جسم میں پھرتا تھا کو بہ کو
کرتا تھا کلمِ حق سے یہ برجستہ گفتگو افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو

گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

جو لوگ حضرت فصیح الملک مرحوم کی شاعری کو بازاری باتیں کہا کرتے ہیں یہ شعر ان کا منہ بند کرنے کو کافی ہے۔ جناب احسنؔ نے کس خوبی سے اسے واقعات کربلا سے مربوط کر دیا ہے۔ مرغِ پریدہ کی تفسیر اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔ سایہ افتادگی جستجو زمین ان تمام الفاظ کا اس تخمیس میں پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ تیسرے مصرعے کے الفاظ حق اور برجستہ گفتگو کتنے ضروری ہیں۔ ربط کے لحاظ سے ایک ایک لفظ بیان کردہ واقعات کا جزو لاینفک ہے۔ اس قسم کے بہت سا انتخاب پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر طوالت کے خیال سے مختلف مقامات کے دو تین بند اور یہاں نقل کر دیئے جاتے ہیں۔ اہل ذوق خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ سلامی میدان میں جناب احسنؔ کا پایۂ کلام کس امتیازی

حیثیت کا اور کس عروج تک پہنچا ہوا ہے۔

شریر فوج مخالف ہیں جمع تھے جتنے وہ خود نہ گن سکے ظلم و ستم کیے اتنے
نہ پوچھیے کہ ہوئے حشر رونما کتنے فسونِ گردوں نے اُٹھائے ہزار ہا فتنے
حسینؑ نے لب معجز بیاں سے کچھ نہ کہا

وہ بادشاہ دو عالم وہ خلق کے سردار بشر تو ہے مگر ایسے ملک ہوں جن پہ نثار
مدد کسی کی خدا کے سوا نہ تھی درکار اٹھائے رنج مگر باوجود حالتِ زار
جہاں پناہ نے اہلِ جہاں سے کچھ نہ کہا

امام وقت کا فیض ہدایت تھا گہراں مایا ہما یا یہ ہوا جس پہ اس کا پڑ گیا سایا
مگر اعداء کی بدبختی نے ایسا انکو ٹھکایا نہ چونکے حضرت شبیر نے ہر چند چونکایا
عجب سوئی ہوئی تقدیر تھی غفلت شعاروں کی

اسیرانِ وفا اہلِ جفا کے ظلم سہتے ہیں مگر وہ آہ کرتے ہیں نہ آنسو انکے بہتے ہیں
انہیں کے واسطے الفاظ قرآنی یہ کہتے ہیں شہیدان راہِ حق میں قتل ہو کر زندہ رہتے ہیں
کفن کی ان کو پروا ہے نہ حاجت ہے مزاروں کی

عذوبت بیاں اور حلاوت زباں کے لحاظ سے چاروں بند فصاحت کی جان اور بلاغت کا ایمان ہیں۔ پہلا اور چوتھا بند اتنے تنگ اور اتنے محدود قوافی میں کہا ہے کہ پانچواں قافیہ ملتا ہی نہیں۔ اس مشکل کے باوجود یہ بند کتنے برجستہ اور ہیں۔ دوسرے بند میں اہل جہاں کی نسبت سے جہاں پناہ کتنا قیمتی لفظ ہے۔ تیسرا بند بھی روانی اور بیان کی بے تکلفی کے لحاظ سے اس پائے کا ہے کہ کسی بند میں کوئی مصرعہ ایسا نہیں جو ضعف بیان کی وجہ سے اپنے رفیقوں کے سامنے شرمندہ وجود ہو۔ آخری بند میں سہل ممتنع کا رنگ کتنا

دلکش ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جناب حسنؔ مرحوم کا یہ مجموعہ کلام خواہ وہ رباعی کی صورت میں ہے یا سلام اور تخمیس کی شکل میں ان کی استادانہ شان کا آئینہ دار اور ان کی گوہر فشانیوں کا گنجینہ ہے محاسن کلام کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ حضرت داغؔ کا انداز بیان قدم قدم پر اپنی جھلک دکھا رہا ہے۔ زبان کی شستگی بیان کی اصابت اور پختگی ڈھلے ہوئے مصرعے جچے تلے الفاظ اور ان کا برمحل استعمال بیان کی صفائی اور بے تکلفی شعر پڑھا اور دل میں اتر گیا۔ نکات فن اور حسن سخن کے لحاظ سے مرحوم کی معجز بیانی ہر سخن شناس و نکتہ سنج سے خراج تحسین لیے بغیر نہیں رہتی۔

یہ نوادر افکار جو کارنامۂ غمؔ کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں بلاشبہ اس قابل ہیں کہ انہیں گنج گراں مایہ کہا جائے۔ اور مرحوم کے قابل فرزند اسے اپنے نام ور باپ کا بیش بہا اثاثہ خیال کریں۔ اگرچہ مرحوم کے جوش عقیدت کو اس حسن کلام اور جوش بیان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر عطوفی ابراحسنیؔ نے غلط یا صحیح خیال سے ان دونوں عناصر کو علیحدہ رکھنا ہی مناسب اور مصلحت وقت سمجھ کر اس کتاب کا نقد و تبصرہ راقم الحروف کے سپرد کیا تاکہ بحث صرف حسن سخن تک محدود رہے اور جوشِ عقیدت کی ہمنوائی اس تبصرہ میں شامل حال نہ ہو سکے۔ مگر حق یہ ہے کہ دل سے نکلی ہوئی آواز اسی جوش عقیدت کے زور سے زبان پر آئی ہے۔ اس کے بعد وہ حسن سخن کے پیرہن کا کہ فضائے ادب میں پھیلی ہے۔ گرمئی کلام جو ان نوادر

افکار میں نمایاں ہے دونوں عناصر کی کیمیائی ترکیب کا نتیجہ ہے۔

دیوانِ حسرتؔ موہانی

(حصّہ یازدہم)

یہ نہائت مختصر مجموعۂ کلام جس کی قیمت صرف دو آنہ اور ضخامت دس صفحوں کی ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی دام برکاتہٗ نے مشاعرہ منعقدہ ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں مجھے بطور تبرک مرحمت فرمایا تھا۔ نوعیت کلام کے متعلق کوئی تعریف یا تعارف محض خامہ فرسائی ہے۔ کیونکہ مولانا موصوف دنیائے شاعری میں امتیازی حیثیت کے مالک اور آسمانِ سخن کے درخشندہ ستارے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں ان کی شخصیت اور ان کے کلام بلاغت نظام کی شہرت ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ کلام کی کتابت و طباعت اور کاغذ کی نوعیت میں انتہائی کفائت شعاری سے کام لیا گیا ہے۔ زمانہ حال کا مذاق اس کفائت شعاری کو بخل سے تعبیر کرے تو اسے قابلِ الزام یا قابلِ حرف گیری نہیں کہا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ جواہرات پھٹے اور کوڑے کرکٹ میں بھی جواہرات ہی رہتے ہیں۔ صرافِ سخن لباسِ ظاہری کا معتقد نہیں ہوتا۔ وہ گوہر شاہوار کو سنگ ریزوں میں بھی شناخت کر لیتا اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ مگر بایں ہمہ جواہرات کے مالک کے لیے بیش بہا ملکیت درخورِ اعتنا ہونی چاہیے۔ جو چیز

تاج میں جوڑے جانے کے قابل ہے۔ اسے چیتھڑوں میں لپیٹ
دینا جواہرات کو خذف سمجھنے کے مترادف ہے۔ ہر شخص قرانِ سخن
نہیں ہوتا۔ دنیا پہلے حسنِ ظاہری کو دیکھتی ہے۔ اس کے بعد
حسنِ باطن پہ متوجہ ہوتی ہے۔ مولانا اپنی ضروریاتِ زندگی میں جس
حد تک سادگی پسند ہیں۔ وہ اس غریب ملک کے لیے باعثِ تقلید
ہے۔ مگر کلام کی اشاعت پر بھی اسی عادت کا اثر انداز ہونا افراط و
تفریط کا مصداق ہے۔ اس مجموعہ کو تو دیکھکر تو یہی کہنا پڑتا ہے
کہ مولانا خود اپنے کلام کے قدر شناس نہیں ہیں۔ ایک آنہ قیمت
اور بڑھا کر اس کی ظاہری صورت میں دلکشی پیدا ہو سکتی تھی۔ تعجب ہے
کہ رئیس المطابع کا پتور تے بھی جہاں اس دیوان کی طباعت ہوئی ہے
مولانا کو اس فروگذاشت پر متوجہ نہ کیا۔ حالانکہ اپنے نام کے
لحاظ سے بہ اس کا ضروری فرض تھا۔ اب دنیا اس دنیا نوسی کتابت و
طباعت کو دیکھکر اس مطبع کو رئیس المطابع کیونکر مان لے گی بہر حال
یہ فروگذاشت خود مطبع کی ہو خواہ مولانا موصوف کی مجبوریوں کی وجہ
سے ہو، قابلِ افسوس ضرور ہے۔ دو آنہ قیمت کے باوجود اس
کی تعداد اشاعت صرف پانچ سو ہے۔ اس سے قیاس تو یہی ہوتا ہے
کہ مولانا کی مجبوریاں ہی اس قسم کی اشاعت کے لیے براہِ راست
ذمہ دار ہیں۔ تمام اصحابِ ذوق کو اس مختصر دیوان کی ایک ایک جلد
(دس صفحوں کا ایک جز دبھی نہیں ہو سکتا) جلد کہنا تو محض تصنع ہے
یعنی ایک ایک نسخہ ضرور طلب فرمانا چاہیے۔ تاکہ مولانا کے کلام فصاحت
التیام سے محظوظ ہونے کے علاوہ وہ یہ بھی اندازہ کر سکیں کہ

ہندوستان میں نامور شعراء نامور مصنف نامور انشا پرداز اور
نامور اہلِ قلم کسی افلاس کا شکار ہو رہے ہیں - اس کو دیکھکر
انہیں بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ جن شعراء کو وہ رئیس المتغزلین مانتے
ہیں - رفتارِ زمانہ سے انہیں اتنی مقدرت بھی حاصل نہیں کہ اپنے
بیش بہا کلام کو کسی دلکش صورت میں شائع کر سکیں -

غالب شکن

(یگانہ چنگیزی)

یہ کتاب مرزا یگانہ چنگیزی کی تصنیف منیف ہے۔ اس میں
کیا لکھا ہے۔ یہ بات کتاب کا نام سن کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔
دراصل یہ رسالہ حضرت یگانہ کے اس مکتوب کی کتابی صورت
ہے۔ جو انہوں نے سید مسعود حسین صاحب رضوی ایم اے
پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کے نام پروفیسر صاحب موصوف کے ایک
خط کے جواب میں لکھا تھا۔ ۳۲ صفحے کی ضخامت میں بیس صفحے
اس مکتوب سے مختص ہیں۔ باقی صفحات پہ مرزا صاحب کی مزاحیہ
رباعیات درج کردی گئی ہیں۔ ان رباعیات میں غالب مرحوم کے
ان واقعاتِ زندگی پر تلخ تنقید کی گئی ہے۔ جو حضرت
غالب کے شاعرانہ کمال سے کوئی خاص تعلق و علاقہ نہیں رکھتے۔
جہاں تک کمال فن کا تعلق ہے۔ ہم ان رباعیات کو بھی ان خاص
خوبیوں سے مالا مال پاتے ہیں۔ جو مرزا یگانہ کے حسنِ بیان سے
مخصوص ہیں۔ مزاحیہ مضامین نے حسنِ بیان کو اور بھی چمکا دیا
ہے۔ لیکن نفسِ مضمون کے لحاظ سے ان پر کوئی اظہار رائے
کرنا خصوصاً اس دور میں جسے غالب پرستی کا دور کہنا چاہیئے ہمارے

لیے سخت دشوار ہے۔ اس محل پر حضرت غالب کا یہ مشہور
مصرعہ لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"
باقی رہی وہ نثر جو شروع کے بیس صفحات میں مکتوب یگانہ
کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ اس میں حضرت یگانہ
نے غالب پرستی کا طلسم توڑنے کے لیے خوب زورِ قلم دکھایا ہے۔
بحث کا ہر ایک حصہ اگرچہ چار خانہ ہنگامہ آرائی سے تعبیر کیا
جا سکتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں منطقیانہ استدلال
اور حکیمانہ اندازِ بیان کی پوری شان موجود ہے۔ اتنی بے باکانہ
صاف گوئی کے باوجود اتنا سنجیدہ ادبی مناظرہ اردو زبان میں
بہت کم نظر آئے گا۔ طرزِ استدلال اس قدر پختہ ہے کہ ہر شخص
کو غالب پرستی کی تعمیریں متزلزل نظر آتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ
مکتوب اس قابل ہے کہ حضرت غالب مرحوم کی مذمت کا خیال
بالائے طاق رکھ کر ہر شخص صرف ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کا
مطالعہ کرے اور ایک غیر جانبدار کی حیثیت میں اس کے ادبی محاسن
سے لطف اندوز ہو۔ اس حیثیت میں ہم بھی مرزا یگانہ کو اس
معجز نما انشا کی داد دیتے ہیں۔ اور ہر موافق و مخالف سے یہ مختصر
کتاب بہ غور تعمق پڑھنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔
ہمارے خیال میں اگر یہ حقیقت قابلِ التفات نہیں کہ مرزا صاحب
نے کیا کہا ہے تو یہ ضرور قابلِ دید ہے کہ انہوں نے
کیسا کہا ہے اور کس خوبی سے کہا ہے۔

نغمۂ فردوس

حصّہ اوّل

خوشی محمد ناظرؔ

یہ قابلِ قدر کتاب چودھری خوشی محمد صاحب ناظرؔ بی۔اے۔
سابق گورنر اور سابق وزیر ریاست جموں وکشمیر کا مجموعۂ کلام ہے،
جسے مولوی محمد عبد اللہ صاحب کامل ایم۔اے۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج
لائل پور نے مرتب فرما کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔
ضخامت دو صد صفحات۔ قیمت دو روپے۔ کاغذ کتابت اور
طباعت کی خوبیاں مستغنی التوصیف ہیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ حرکات و
سکنات کی کتابت میں بھی اہتمام بلیغ سے کام لیا گیا ہے۔ اور یہ
خوبی زمانہ حال کی جدید مطبوعات میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ مثلاً
ہائے مخلوط کو اس کتاب میں ہر جگہ دو چشمی لکھا ہے۔ جن
الفاظ کا تلفظ مختلف فیہ ہے۔ وہاں ان کی دونوں صورتوں
میں تمیز کرنے کے لیے حرکات لکھدی گئی ہیں۔ مثلاً طرح اگر بے سکون
رائے مہملہ آیا ہے۔ تو رائے مہملہ پر جزم لکھ دیا ہے۔ گلستان
میں اگر لام ساکن آیا ہے تو اس پر علامت سکون لکھ دی ہے۔
تاکہ مصرعہ پڑھنے والا علامات کو دیکھ کر صحیح مصرعہ پڑھ سکے۔

گناہ اور گنہ اور نگاہ اور نگہ راہ اور رہ آئینہ اور آئنہ میرا اور مرا

تیری اور تیزی وغیرہ کی کتابت بھی اسی امتیازی طرز میں شامل
کردی ہے۔ تاکہ یہ الفاظ اسی طرح پڑھے جائیں۔ جس طرح
شاعر نے ان کو باندھا ہے۔ اس قسم کی پابندی اختیار کرنے
سے ظاہر ہے کہ کتابت کا ظاہر حسن جس قدر دلکش بنانے کی
کوشش کی گئی ہے۔ اس قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی
معنوی خوبیوں کو حسن باطن سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے۔
حرکات و سکنات اور اعراب کی یہ پابندی محکمہ تعلیم کی درسی
کتابوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ فارسی کی درسی کتابوں کا تو باوا آدم
ہی نرالا ہے۔ ان کتابوں میں حرکات کا اظہار تو درکنار یائے مجہول
اور یائے معروف کی کتاب بھی دقیانوسی طریقے سے کی گئی ہے۔ مثلاً

نہ زردارے یہ زرداری نہ درویشے یہ درویشی

یہ مصرعہ اس طرح لکھا ہوا نظر آئے گا۔

نہ زرداری یہ زرداری نہ درویشی یہ درویشی

اس کتاب کو دیکھکر ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیچارے
نو آموز طالب علم اس مصرعہ کو کس طرح پڑھ سکتے اور صحیح
طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جب درسی کتابوں کا یہ حال ہے تو غیر درسی
کتابوں کی کتابت کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ہائے دوچشمی کی
اس قدر مٹی خراب کی جاتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ جہاں اس کی
ضرورت ہے وہاں دلہن کو دلہن۔ دودھ کو دودہ لکھدیا جاتا
ہے۔ اور جہاں ضرورت نہیں وہاں ہے کو ھے ہیں کو ھیں رہے
کو رھا لکھ دیتے ہیں۔ غالب ذوق کا یہ شعر اس قسم کی کتابت پر

مستقل ہدایت سمجھنا چاہیے۔

ہائے دی حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی
نکلنے ہیں ہاتے دو چشمی سے کتابت والے

نظم گوئی میں جناب ناظر مولانا حالی کی روشنی پر گامزن ہیں۔ استفادہ سخن بھی انہیں کی ذات بابرکات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل نہیں۔ اس مجموعہ میں غزلیات صرف بیس اکیس صفحات میں ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر مولانا حالی ہی کے انداز میں ہیں۔ باقی کلام زیادہ تر قدرتی مناظر اور مختلف واقعات زندگی یا حسب ضرورت ملکی سرکاری تقریبوں پر مشتمل ہے۔ یاد رفتگاں کے عنوان سے دو تین ماتمی نظمیں بھی ہیں۔ دو تین سہرے بھی ہیں۔ آخر میں چند رباعیات بھی ہیں۔ ان مختلف اصناف سخن کو دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی اور ناقابل التفات چیزوں کو بھی ناظر صاحب نے اپنے حسن طبیعت سے قابلِ التفات بنا دیا ہے۔ ایک نظم کا عنوان لیڈر اور شاعر کا مناظرہ ہے۔ حق یہ ہے کہ اس مناظرہ میں جناب ناظر نے خوب دادِ سخن دی ہے۔ اور اسے دیکھکر مولانا حالی کا مناظرہ شاعر و واعظ یاد آجاتا ہے۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکے گی۔

ہمارے حسین

(از طالب دہلوی)

یہ کتاب گذشتہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں جناب برق دہلوی مرحوم کے شاگرد طالب کیستھ دہلوی نے شائع کی ہے۔ مضمون تو نام ہی سے ظاہر ہے۔ مگر تفصیل یہ ہے کہ اس میں ہر ایک نظم اور ہر ایک سلام سید الشہداء کی شان میں صرف ہندو شعراء کے افکار بلیغ کا نتیجہ ہے۔ اول سے آخر تک اسی عنوان کے ماتحت منظوم مضامین ہیں۔ ضخامت ۸۰ صفحہ کی اور قیمت سوا روپیہ ہے۔

یہ تصنیف فی الواقع ایک جدت ہے۔ اور اسے طالب صاحب نے دو ڈیڑھ مہینے کی دوڑ دھوپ اور سرگرم جدوجہد سے مرتب اور شائع کر کے گذشتہ محرم میں ہندو شعراء کی طرف سے شیعہ حضرات کی خدمت میں جن کی تعداد ہمارے وطن میں لاکھوں میں ہے۔ پیش کیا ہے۔ اس قسم کی اتحاد پرور کوششوں کے لئے طالب صاحب اور وہ تمام ہندو شعراء جنہوں نے ان کی فرمائش پر یہ خوشی آمادگی ظاہر کی۔ تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں ہمیں یقین ہے کہ ہمارے

وطن کی اتحاد پر درجا میں خواہ وہ سیاسی نوعیت کا ہوں یا غیر سیاسی نوعیت کی۔ اس کتاب اور اس پبلیکیشن کو نہایت پراخلاص اور قابلِ قدر خیال کریں گے۔ اسی بے لوث اور پر خلوص خدمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کتاب کا حق تصنیف اور تمام حقوق طالبؔ صاحب نے اپنے ایک مہربان دوست سیّد ہادی حسین رضوی بی۔اے۔ کے نام منتقل اور محفوظ کر دیے ہیں۔ اور انہیں سے یہ کتاب مشتاقانِ سخن اور اہلِ ذوق کو نئی دہلی تھامسن روڈ کے پتے سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب کا شانِ نزول بھی شروع میں درج کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں سید صاحب طالبؔ صاحب کے مکان پر ملاقات کے لیے آئے اور حضرت امام حسین علیہ السلام سے متعلق ان کی کچھ رباعیات جو وہ پہلے سن چکے تھے۔ طلب کیں۔ چاہتے تھے کہ انہیں پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ بیاض لے گئے اور جب واپسی کا مطالبہ کیا تو فرمانے لگے۔ کہ جب تازہ رباعیات اور سلام لکھو گے تو بیاض واپس کی جائے گی۔ ورنہ نہیں۔ اسی وقت طالبؔ صاحب نے جواب میں کہا کہ میں موجودہ دَور کے بہت سے ہند و شعرا کا کلام حضرت امام حسینؑ کے متعلق جمع کر کے کتابی مسودے کی صورت میں پیش کر دوں گا۔ اسی لیے بیاض مجھے واپس دے دی جائے۔ سیّد صاحب نے پوچھا۔ کب تک طالبؔ صاحب نے اقرار کیا کہ مخزن کیا۔ اس طرح سیّد صاحب

کو رضامند کر لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ مشکل دو مہینے کی مہلت طالب صاحب کو میسّر ہوئی۔ اتنے تنگ وقت میں شعرائے سے خط و کتابت کرنا تازہ کلام لکھوانا تقاضا کرنا یاد دہانی زحمت انتظار امید و یاس کا عالم پھر شعرا کے وعدے جن پر حسینوں کے وعدہ فردا کا پورا عکس جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر اس کی ترتیب۔ کتابت۔ طباعت کاغذ کے لئے دوڑ دھوپ غرض صد ہا مشکلات تھیں۔ جن سے عہدہ برآ ہو کر ٹھیک وقت یعنی محرم کے دن یہ کتاب پیش کر دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ کتابت میں بھی کچھ غلطیاں رہ گئیں۔ اور ان کے لیے صحت نامہ شامل کرنا پڑا۔ بعض شعرا بھی عجلت میں کہے ہوئے اشعار پر نظر ثانی نہ کر سکے ہوں گے۔ اور اصلاح حاصل کرنے کا بھی انہیں وقت نہ ملا ہو گا۔ اس لیے بعض جزوی فروگذاشتیں بھی موجود ہیں۔ جن کے لیئے طالب صاحب بلا شبہ معذور کہے جانے کے مستحق ہیں۔

بہت سا کلام بہت پختہ نہایت شگفتہ اور قابلِ داد ہے۔ ان میں ہندو شعرا کے جذبات متعلقہ سید الشہدا کی صحیح تصویر نہایت نمایاں صورت میں نظر آتی ہے۔ مثلاً منوّر صاحب کا یہ قول کہ

توحید کے آئین جہان گیر نہ ہوتے۔ ممتاز شہادت سے جو شبیّر نہ ہوتے
اسلام نہ رہتا کسی تدبیر سے زندہ۔ اسلام ہے قربانیٔ شبیّر سے زندہ
سی مذر آئینہ حقیقت ہے پوری نظم اسی خیال کے ماتحت کہی گئی ہے

اسی طرح سری گوپی ناتھ امن لکھنوی کا یہ قول

حسینی شان کہہ بیٹھیں یہ کہہ دے میری نظروں میں

جبیں فرسائیوں کا نام سجدا ہو نہیں سکتا

بہت مرتی خیز اور سراپا شعریت ہے۔ اسی طرح شیدا صاحب ایم۔ اے
کی ایک پر مغز نظم کے آخری شعر سنیئے۔

مجاہدین کو عزم حسین لازم ہے۔ ابھی جہاں کے ہیں والی یزید و ابن زیاد
یہ نظم ملک کے سیاسی رنگ میں بہت ہی قابلِ قدر ہے۔ اسی طرح نانک لکھنوی
کا بہت سا کیف پرور کلام اس مجموعہ میں شامل ہے۔ دو شعر سنیئے۔

فاطمہ بھی رو پڑیں میری اشک افشانی کے ساتھ
خود پریشاں ہو گئیں میری پریشانی کے ساتھ

کاٹ کر جب فرق مرحب کو اٹھی تیغِ عس
چار آئینہ بھی منہ تکتے تھے حیرانی کے ساتھ

اس زمین کو دیکھئے اور ان اشعار کی فنی خوبیوں کا اندازہ کیجئے۔ آپ
یہ سن کر حیران ہوں گے کہ نانک لکھنوی اُمّی شاعر ہیں۔ ساحر
ہوشیار پوری کے گلہائے عقیدت کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

خدا سے دولت و زر مانگ لعل و گوہر مانگ | نگین و خاتم و تاج و کلاہ و کشور مانگ
جو تشنہ لب ہے تو لاریب آبِ کوثر مانگ | مگر یہ شرط ہے نام حسین لے کر مانگ

کمی نہیں ہے کسی شے کی اس خزانے میں

مفتون صاحب شکوہ آبادی کے دو شعر بھی سن لیجئے۔

مطلب نہ رہا کیوں سے نہ کچھ واسطہ کیا سے
آگاہ تھے وہ شیوۂ تسلیم و رضا سے

بیتاب ہوئے اور بھی جذبات سے عابد۔
خالی نظر آئے انہیں آنکھوں کے جو کاسے

شاید یہ نامناسب نہ ہوگا۔ اگر میں اپنے کلام میں سے بھی دو شعر یہاں درج

کر کے مزید اظہارِ عقیدت پیش کروں۔

پانی بھی کسی کو نہ دیا اہلِ ستم نے ــــ پیاسے رہے بہتّر کے بہتّر لبِ دریا
وہ سرد مزاجوں کے مظالم سرِ میداں ــــ وہ گرمیٔ ہنگامۂ محشر لبِ دریا

الغرض طالب صاحب کی یہ کوشش آج کل کی بدگمانی اور اعتراف انگیزی کے دور میں لیسا غنیمت سمجھنی چاہیے۔

اگرچہ دو تین شعرا کو اپنے کلام پر مزید توجہ اور نظرِ ثانی کی ضرورت لازمی تھی۔ مثلاً مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی ایم۔اے جو حضرت سیماب کے شاگرد ہیں۔ صفحہ ۹۸ پر ان کے اشعار میں سے دو تین شعر قابلِ ذکر ہیں۔

پیدا جو ہوتا ہے اس کو ایک دن مرنا بھی ہے
کارگاہِ زندگی میں کام یہ کرنا بھی ہے

یہاں پیدا کی الف خاص طور پر محلِ نظر ہے۔ اس کے علاوہ مرنے کو بھی کام کرنا کہا گیا ہے۔ افسوس اور نیتیے۔

دل میں پیدا جذبۂ شوقِ شہادت کر دیا ــــ موت ہی کو ہستیٔ جاوید ثابت کر دیا

شہادت اور ثابت کا قافیہ غلط ہے۔ دال مفتوح ہے اور بے مکسور

گردشِ دوراں میں ناحق زندگی سے پیار ہے ــــ مقصدِ ہستی فقط ایثار ہی ابتار رہتے

یہاں گردشِ دوراں میں لفظ گردش بالکل بے ضرورت صرف ہوا ہے۔
تلخیٔ دوراں زیادہ مناسب تھا۔ اس سے مضمون زیادہ مربوط ہو سکتا ہے۔

کوئی دنیا میں امر ہو کر نہیں رہتا مدام ۔۔۔ الخ

امر یعنی لافانی (زندۂ جاوید) کہا گیا۔ تو پھر مدام کی کوئی ضرورت

باقی نہیں رہتی۔

زیست کا مقصد فنا کے ماسوا کچھ بھی نہیں

ماسوا بمعنی سوا تو کبھی صورت ہی میں آتا ہے۔ اردو کے مرکب
اضافی میں ماسوا روزمرہ سے خارج ہے۔ یہاں فنا کے سوا کہنا فصیح
تھا۔ سنا ہے کہ ضیا صاحب فارغ الاصلاح کہے جاتے ہیں۔ اگر یہ
درست ہے تو ایسی فروگذاشتیں قابلِ تعجب ہیں۔ شاید عجلت میں
مزید توجہ اور نظرِ ثانی کا موقع نہ ملا ہو۔ طالب صاحب کو لازم تھا کہ
یا تو ایسے اشعار اشاعت میں شامل نہ کرتے یا مصنف کو مزید توجہ
کی تکلیف دیتے۔ اسی طرح آفتاب صاحب کے دو تین شعر صفحہ نمبر ۶۶
پر ملاحظہ ہوں۔

زیرِ خنجر بھی عبادت میں رہا تو مشغول ——— تیری قربانی پہ عالم کیوں نہ ہو قربان حسین رضی
حشر تک بیدرد قاتل بھی نہ پائیں گے سکوں ——— کربلا کی خاک سے اٹھتے ہیں وہ طوفاں حسین رضی
قتل جب تجھ کو کیا جلاد نے وقتِ نماز ——— اہلِ دل کیا سنگدل بھی ہو گئے گریاں حسین رضی

ان اشعار میں ردیف برائے بیت ہے۔ قافیے پر مطلب اور مفہوم ختم ہو جاتا
ہے۔ قافیے اور ردیف کا باہمی ربط ہمیشہ لاینفک ہونا چاہیے۔ ردیف
کا معلق ہونا نمایاں سقم ہے۔

کتاب کی ترتیب و تدوین میں ایک غلطی ایسی بھی ہوئی ہے
جسے بہت نمایاں کہنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ طالب صاحب نے میرے نام
کے ساتھ صفحہ ساٹھ پر بھی بی۔اے لکھ دیا ہے۔ حالانکہ میں انگریزی
صرف اس قدر جانتا ہوں۔ جتنی شیخ چلی جانتے تھے۔ معلوم نہیں
اس غلطی کا ماخذ کیا ہے۔ خیر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس
قسم کی فروگذاشتیں اس کتاب میں محض جزوی اور فروعی حیثیت

کی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے طالبؔ صاحب کی اس ملکی اور فنی خدمت کی
جدت و افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی
کتابیں ہمارے محمدؐ۔ ہمارے نانک۔ ہمارے عیسےٰ۔ ہمارے رام
ہمارے کرشن وغیرہ کے نام سے منصۂ شہود پر آئیں تاکہ ہر مذہب
کے بزرگانِ کرام کا احترام کئے جانے کا جذبہ سب دلوں میں پیدا ہو
اور یہ نفاق انگیز وبا ہمارے عزیز وطن کی تباہی و بربادی کا باعث نہ بنے۔

متینؔ کے سو شعر

جناب متین مچھلی شہری شاگرد خاص حضرت فصیح الملک داغ دہلوی کے یکصد اشعار جناب سید سعدی جعفری کی کوشش اور اہتمام سے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ کاغذ و کتابت اور طباعت میں حسن ظاہر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جناب نواب سائل دہلوی نے اس منتخب مجموعہ کو بجا طور سے سحر صد دانہ کہا ہے۔ جناب متین کے کلام میں حضرت داغ مرحوم کا رنگِ سخن بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ موصوف کی بعض برجستہ و شگفتہ غزلیات رہنمائے ذیلم میں اس سے پہلے بھی زینتِ اشاعت ہو چکی ہیں۔ اس مجموعہ کے بعض اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

حضرت شیخ ہیں کس جنس سے اے خالق کل
نہ ملک ہیں نہ بشر انسان نظر آتے ہیں

• • •

ناامید دید کوئے یار سے پھرتا ہوں جب
شوق کہتا ہے لگا لو ایک چکر اور بھی

اسی زمین میں چکر کا قافیہ جناب متین ہی کا حصہ ہے۔ ان کو بے لطف کا متراد نہیں سکتا جو بدمزگی اس کی گوارا نہیں کرتے

بس اتنا فرق ہے پتھرا گروہ ہے تو یہ پانی
تمہارے پاس بھی دل ہے ہمارے پاس بھی دل ہے

• • •

غرقِ بحرِ عشق ہو جانے تو بیڑا پار تھا کیوں ڈبویا کیوں مجھے بدنام ساحل نے کیا

آخری شعر جس غزل کا ہے۔ وہ رہنما تے تعلیم میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ شعر مجھے اب تک نہیں بھولا۔ اور نہ یہ بھولنے کی چیز ہے۔ دونوں مصرعوں کے الفاظ اپنی مناسبت میں لاثانی واقع ہوئے ہیں عہ۔ بیڑا پار تھا اور کیوں ڈبویا۔ ان الفاظ نے تو دونوں مصرعوں کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ الغرض یہ مختصر مجموعہ کلام بلاشبہ قابلِ قدر چیز ہے۔ مکتبۂ ادب الہ آباد کے پتے سے طلب فرمائیں۔

باغِ خیال

یہ کتاب جس کی ضخامت بڑی تقطیع کے ۳۷۸ صفحات کی ہے۔ اور جسے لالہ دیوان چند گدڑھوک ساکن بھون ضلع جہلم نے بہت سی محنت شاقہ گوارا فرما کر تالیف کیا ہے۔ اردو زبان کے سینکڑوں نامی شعرائے سابق و حال کے کلام کی بہت سی ورق گردانی کا نچوڑ اور بہت سی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ باذاق مولف نے اس میں ساڑھے سات ہزار کے قریب نہایت دلچسپ اشعار مذہبی۔ علمی ادبی رندانہ۔ ناصحانہ۔ متصوفانہ اور عاشقانہ وغیرہ مختلف قسم کے ایک سو دس عنوانوں کے تحت جمع کیے ہیں۔ جس سے ہر مذاق کا آدمی بہرہ مند و بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ اور کسی ایک عنوان کے تحت بیسیوں بلکہ سینکڑوں اشعار ایک جگہ جمع کیے ہوئے دیکھ سکتا اور مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں وہ تمام عنوان موجود ہیں۔ جن کو شعرائے اردو فارسی نے اپنی جولانگاہ بنایا اور اپنی خوش بیانی کا حق ادا کیا۔ فقر و غنا رندی و تقوی۔ جنت و دوزخ۔ ہستی و عدم۔ ہجر و وصال۔ حرص و قناعت۔ حسن و عشق۔ کعبہ و بتخانہ۔ ناؤ و نوش۔ جوانی و پیری شمع و پروانہ۔ تکبر و انکسار۔ حیات و ممات وغیرہ میں سے ہر ایک عنوان کے ماتحت آپ مختلف شعرا کے خیالات و ارشادات ایک جگہ ملاحظہ فرمانا چاہیں تو اس کتاب کو اپنے پاس رکھیے۔

ان عنوانوں پر کثیر التعداد اشعار منتخب کرتے ہیں جس محنت اور
تلاش کی ضرورت ہے وہ ناظرین سے مخفی نہیں۔ نزاکت کے
مضمون پر آپ کو بیس شعر مل جائیں گے۔ مکتوب شوق کے عنوان
پر ٨٦ اشعار کا مجموعہ آپ کو مل جائے گا۔ فقر و غناء کے عنوان پر
٨٢ اشعار کا آپ مطالعہ کر سکیں گے۔ ناکامی محنت پر ایک سو گیارہ شعر
ایک جگہ نظر آئیں گے۔ نتیجہ عشق معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو
ایک سو پچاس اشعار آپ کے سامنے ہوں گے۔ اس پر التزام
یہ التزام کہ زیادہ تر وہی اشعار منتخب کیے گئے ہیں جن کو دربار
شہرت سے قبول عام کی سند عطا ہو چکی ہے۔ گویا اردو کے وہ
تمام اشعار جو عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ آپ اس میں
موجود پائیں گے۔ اس کے علاوہ جو شعر جس کی ملکیت ہے۔ اس کا نام بھی
حاشیہ میں درج کیا گیا ہے۔ اس میں بھی یہ پابندی صاف اور
نمایاں نظر آتی ہے۔ کہ عموماً نامور اور مشہور اساتذہ ہی کا کلام بلاغت
نظام پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف شعرائے
کرام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق صدہا طریقوں سے بیان فرمایا
ہے۔ یہ تنوع چونکہ اس مجموعے کے ہر صفحے پر اپنی بہار دکھا رہا
ہے۔ اس لیے ایک ہی قسم کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے
پر جو بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ اس میں یہ عیب بھی نہیں ہے۔
شعرائے کے ذہنی ارتقا کا اندازہ بھی ایک ہی مضمون کے مختلف
اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اور اس بحث کے لیے مثالیں خود
تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ مبتدی اور مشق شعراء کے لیے

بھی یہ ضخیم مجموعہ اس وجہ سے بے حد فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے۔
اس کو پڑھ کر وہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کے مختلف
اسلوب بیان کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں مزید ترقی کی کہاں تک
گنجائش ہے۔ الغرض مولف کی محنت شاقہ ہر لحاظ سے قابلِ داد
ہے۔ قیمت دو روپے ہے۔ جو اس کی ضخامت اور کاغذ کتابت و
طباعت وغیرہ کی خوبیوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں۔ قدرشناسان
ادب اردو کا بالعموم اور کتب خانوں کے سرپرستوں کا بالخصوص
اس کتاب کا ایک ایک نسخہ خرید کر مولف کی محنت کا جو بلاشبہ
قابلِ ستائش ہے۔ اندازہ کرنا اور اس دلکش و مفید تالیف کے
مطالعہ سے لطف اٹھانا چاہیے۔ مولف ہی کے مذکورہ بالا پتے سے
طلب فرمائیں۔

گنجِ معانی

منشی تلوک چند صاحب محرومؔ بی۔اے کی مقبول عام نظموں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پیشتر بھی ان کا کلام تین جلدوں میں (کلامِ محروم حصہ اوّل۔ حصہ دوم۔ حصہ سوم) اشاعت پذیر ہو کر مقبولِ عام ہو چکا ہے۔ مگر ان کے ہر سہ حصص میں نظمیں اور غزلیات دونوں قسم کا کلام شامل تھا۔ اب انہوں نے حصہ غزلیات کو علیحدہ کر کے کچھ سابقہ نظمیں اور بہت سی جدید نظمیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں۔ اور اس مجموعہ کا نام "گنجِ معانی" تجویز کیا ہے۔ یہ نام فی الواقع بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب کی طباعت و کتابت خاص اہتمام سے ہوئی ہے۔ جلی قلم سے ہر سطر میں ایک ایک مصرع لکھوایا گیا ہے۔ کاغذ بھی نہائت اچھا اور دبیز لگایا گیا ہے۔ حسنِ ظاہری میں یہ کتاب حضرت اقبال کی "بانگِ درا" سے پوری مشابہت رکھتی ہے۔ اور ۲۴۷ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔

کتاب کے شروع میں صوبہ ہذا کے نامور ادیب آنریبل خانبہادر سر شیخ عبد القادر صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا جج ہائی کورٹ پنجاب نے ایک مختصر مگر جامع اور پرمغز دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ حسنِ کتابت میں باوجود اس قدر سعی بلیغ کے کئی جگہ غلطیاں رہ

گئی ہیں۔ ان کی صحت کے لیے چار صفحوں کا اغلاط نامہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی بعض جگہ کاتب کی دست درازی اتنی سنجیدہ ہے کہ اغلاط نامہ بھی اس کی صحت ظاہر کرنے سے قاصر ہے صفحہ ۲۷۹ پہ یہ شعر درج ہے۔

ہر شمع اپنے زعم میں یاں برقِ طور ہے
ہر کنکری کو دعوی ہمسری کوہِ نور ہے

اغلاط نامہ میں صرف یہ لکھا ہے کہ دعوے کو دعوی پڑھو یہ تصریح بے ضرورت ہے۔ واقف اصحاب جانتے ہیں کہ دعوے دعوی ہی کی دوسری صورت ہے اور عیسی موسے کی فارسی والوں کا تصرف ہے۔ خرابی یہ ہے کہ دعوی پڑھنے سے بھی مصرعۂ ثانی ناموزوں ہے۔ کاتب کی یہ فروگذاشت کسی طرح قابلِ معافی نہیں۔ ہر مصنف ان کے ہاتھ سے نالاں ہے۔ اتنے اہتمام اور اتنی جدوجہد پر بھی ایسی فروگذاشتیں نظر آئیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ جماعت کے جوروستم سے رہائی حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

محروم صاحب دنیائے شعر و سخن میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے چیدہ و برگزیدہ جریدوں اور مجلوں نیز اخباروں کے خاص نمبروں میں عزت و احترام سے شائع کیا جاتا ہے۔ صوبۂ ہذا کی درسی کتب میں بھی ان کا کلام داخل کیا گیا ہے۔ اور سابقہ مجموعہ کلام کی اشاعت پہ انہیں سرکار عالیہ کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے۔ اس تمام عزت و افتخار اور نیز اسی جدید مجموعہ کلام کی اشاعت پہ ہم فاضل مصنف کو مبارکباد کہتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ مصنف جن کا کلام ان کی زندگی ہی میں مقبول ہو جائے۔

بعض شعراء ایسے بھی ہیں جن میں کسی نے تو مذہبی اور جماعتی خدمات کی بنا پر شہرت حاصل کی ہے۔ کسی نے اپنی خوش گوئی سے نوجوانوں اور امیروں کا کھلونا بن کر ناموری حاصل کی ہے۔ اور مذہبی تقدیس کی آڑ میں دولت کمائی ہے۔ کسی نے اپنی کامیاب اور مسلمہ زمانہ سازی سے یہ دونوں چیزیں حاصل کر لی ہیں۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ مرحوم صاحب اس قسم کی تمام کوششوں سے بالا تر ہیں۔ ان کی شہرت جو کچھ بھی ہے وہ بالکل حقیقی اور خدا کی دین ہے۔

اس اظہارِ عقیدت کے بعد اب اس کتاب کے حسنِ باطن کی کچھ تفصیل بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہر شاعر کے کلام میں رطب و یابس ہوا کرتا ہے۔ مرحوم صاحب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ زبان کا چٹخارہ اور روزمرہ کی بے تکلفی جو اہلِ زبان کے کلام میں ہوا کرتی ہے۔ مرحوم صاحب کے کلام میں کم ہے۔ اس کے علاوہ فصحائے حال کے متروکات بھی ان کے کلام میں بیشتر ہیں۔ مثلاً یہ بمعنی لیکن یسو یاں واں گر سوا، مت ہن بمعنی بغیر آ گرا کی جگہ آن گرا، بے چارہ، تلک آئے ہے، جائے ہے، چشم نم یا چشم نم، وغیرہ وغیرہ قسم کے الفاظ جو فصحا کے روزمرہ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اور ان میں سے بعض تو زبان سے خارج ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام میں بار بار آتے ہیں۔ تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ان متروکات کے قائل نہ ہوں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ شعر میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے لیے قدیم طرز کلام کی تقلید کر رہے ہیں۔ مثلاً اجزائے فعل کے درمیان فاصلہ اور ان کی تقدیم و تاخیر

اور تقدیم و تاخیر کی صورت میں بھی فاصلہ معیوب نہیں سمجھتے۔ تو مذکورہ
خیال اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں متروکات کے
لیے انہیں معذور سمجھنا چاہیے۔ اس کا روشنی پر بجز اس کے کہ ایسی
زبان فصحائے حال کا روزمرہ نہیں اور کسی حرف گیری کی گنجائش نہیں
ہو سکتی۔

اس سلسلے میں زبان اور روزمرہ کی کچھ اور فرد گذاشتیں
بھی قابلِ ذکر ہیں مثلاً

یہ حال دیکھ کر وہ عزیزِ دل انام — گویا ہوا کہ اہلِ اجودھیا سنو تمام
جاتا ہوں بن کو میں کہ یہ فرماں ہے باپ کا — پہنچانے آپ آئے ہیں احساں ہے آپ کا

پہلے شعر میں لفظ بالکل بے ضرورت ہے۔ دوسرے شعر میں پہنچانے
آئے ہیں یہ بھی روزمرہ سے خارج ہے،

پرماتما کے شکر کرو شاد ماں رہو....

یہاں پرماتما کے شکر کرو کی جگہ پرماتما کا شکر کہنا چاہیے۔

تجھے کیسے حاصل ہو یہ مرتبہ — کہ ہے دشمنوں سے بھی پر خاش جنگ

کیوں کر

یہاں کیسے حاصل ہو کی جگہ کیوں کر حاصل ہو کہنا چاہیے۔ کیسے بمعنی
کیونکہ ہندی بھاشا کی بول چال ہے۔ نیز مصرعہ ثانی ضمیر مخاطب کے
لیے تشنہ نظر آتا ہے۔ اگر اس طرح کہا جائے کہ "تو دشمنوں
سے بھی کرتا ہے جنگ" تو روزمرہ کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

اے حسن جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے۔ کس یاس کے ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمک شب تاب وہ سارے۔ ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

دوسرے شعر کے مصرعۂ اول میں سارے کی جگہ سب کہنا مقتضائے مقام ہے

لنکا کا تخت بیٹھ گیا تاج لٹ گیا

اس مصرعے میں تخت بیٹھ گیا معتبر نہیں۔

قابو سے نکل کشتی کا گرداب میں آنا

ملاّح کی عورت کا وہ یوں شور مچانا

مصرعۂ اول میں قابو سے نکل کر کہنا واجب تھا۔ کشتی کی ی۔ بھی دبتی ہے۔

پوچھا یہ میں نے عالم و عابد میں فرق کیا

کیوں تو نے اختیار کیا اس فریق کو

- کیا کی جگہ - کیا ہے کہنا چاہیے - کیونکہ موجودہ صورت تو عالم و عابد کے درمیان مساوات ظاہر کر رہی اور مفہوم یہ ہے کہ دونوں کا فرق دریافت کیا جا رہا ہے۔

کہتے ہوئے کہ اتنے تو ہم سے خفا ہو رام　　صحرانورد صورتِ موجِ صبا ہو رام

اس شعر میں اتنے کے بعد تو بالکل زائد اور بے محل ہے۔

بہرِ نثار بر کفِ مژگاں گہر تھے ... الخ

یہاں بر کفِ مژگاں خالص فارسیت ہے۔

- یوں تیز تیز کس لیے رستہ کو اڑا چلے　　بوڑھوں کو گردِ راہ میں رگھبر ملا چلے

اڑاتے جا رہے ہو کی جگہ اڑا چلے درست نہیں - اڑا چلے کا استعمال اس سے بالکل متعلق ہے - مثلاً - آئے تھے ہم بھی خاک اڑاتے اڑا چلے نیز مٹی میں ملانا اور خاک میں ملانا کی جگہ گرد میں ملانا بھی روزمرّہ کے خلاف ہے۔

خلقِ خدا یہ طعن ہیں طاعت کا مان ہے

ماں یعنی ضرور ٹکسالی زبان نہیں۔

رو بُرو ہے ہر طرف ساری تریں صاف آتا ہے نظر چرخِ بریں
آہ جنگل کی فضائے دل نشیں کوہ و دریا کے مناظر ہیں کہیں
گھومتا ہے ہر طرف خطِّ نظر مرکزِ ادوارِ عالم ہے بشر

صحرا کی خوبیوں پر جو نظم لکھی ہے یہ اسی کا ایک حصّہ ہے۔ اندازِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناظر صحرا میں بیٹھا ہے اور اس عالم کے مناظر بیان کر رہا ہے۔ نظم کا باقی حصّہ پڑھنے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں لفظ "آہ" بالکل بے محل ہے۔

آندھی تمہیں نمونۂ قہرِ خدا ہے یہ شعلوں سے تند خو ہے بظاہر ہوا ہے یہ
یہاں یا تو شعلہ تند خو کہنا چاہیے یا شعلوں سے زیادہ تند خو کہنا مناسب ہو سکتا ہے۔

زبان میں اس قسم کی جو فرو گذاشتیں دکھائی گئی ہیں ہمارے خیال میں نظر انداز کئے جانے کے قابل ہیں۔ جب ہر اصل زبان ردیف و قافیہ کی دشواریوں اور پابندیوں نیز بندشِ شعر کی مجبوریوں کے باعث باوجود کہنہ مشق ہونے کے روزمرّہ کی بیسیوں غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ تو ایسے شخص سے جس کے لیے اردو زبان اکتسابی ہو اور جو ایک دور افتادہ صحرائی علاقہ کا باشندہ ہو۔ اس قسم کی لغزشیں قابلِ تعجب نہیں ہو سکتیں۔ ہاں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن پر اہلِ فن کو متعجب ہونے کے سوا چارہ نہیں اور جن کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہو سکتی مثلاً۔

۱۔ پستے ہیں جن میں آدمی نظروں کے سامنے — ارض و سما دو پاٹ اس آسیا کے ہیں

۲۔ آہ مرنا بھی ہے مشکل اور جینا بھی محال — آسماں دنیا نہ ہو دو گونہ وقت کا شکے

۳۔ سال بھر تعطیل ہی ہو دبازی ہو اگر — صورتِ کارگراں پھر ہو دبازی ہو دو بھر

پہلے شعر میں دو پاٹ کو دپاٹ ۔ دوسرے میں دگونہ کو دوگونہ تیسرے میں دو بھر کو دبھر باندھا گیا ہے۔ فارسی ترکیب میں دو کو حرف دال کے مفہوم میں باندھنا روا ہے۔ اور اردو ترکیب یا اردو تلفظ میں دو کی پوری آواز فع کے وزن پر آتی ہے۔ مگر یہاں اس اصول کے خلاف عمل کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں واؤ کو گرانا لازم تھا۔ وہاں فع کے وزن پر ہے اور جہاں فع کے وزن پر اسے رکھنا تھا۔ وہاں وہ گرادی گئی ہے۔ دو کا تلفظ اردو میں کبھی اس طرح نہیں آتا کہ ہم اس کی واؤ گرادیں اور فارسی میں اس کو گرانا لازم ہوتا ہے مثلاً

۱۔ قرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را — (دگونہ)

۲۔ دو دل یک شود بشکند کوہ را — (دودل)

۳۔ دریاب کہ انجام دو بنیان چہ بود — (دبنیان)

۴۔ جور حبیب جو رنگ یک نہ شد دو شد — (دشد)

۵۔ خدایا نعمتش باشد دو چنداں — (دچنداں)

۶۔ تو عشق ناز کو خون دو عالم میری گردن پر — (دعالم)

اب دوسری لغزشیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ہائے وہ تیری ظاہر و باطن کی خوبیاں

۲۔ ہائے وہ جوششِ گریۂ پیہم سحاب کا

۳۔ اک دل ہے یا ہزار پیچ و تاب اے وائے ۔ یہ زندگی ہے کہ ہے عذاب الٰہی وائے دربائی کا شعر

تینوں جگہ حرفِ تاسف ہائے اور وائے فعلن کے وزن پر آئے ہیں۔ یہ تلفظ
درست نہیں۔ ہائے فارسی جمع کے لیے آئے تو فاع اور فعلن کے وزن پر
دونوں طرح آتا ہے۔ مگر حرفِ تاسف ہو تو ہمیشہ فاع کے وزن پر مستعمل
ہوتا ہے۔ مثلاً

۱۔ اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد (علی حزیںؔ)
۲۔ ہائے ری حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی (ذوقؔ)

یوں تھی وہ رانیوں کے ہجومِ کثیر میں جیسے ہو ماہتاب نجومِ کثیر میں

ہجومِ کثیر بلا لحاظ اس امر کے کہ انبوہِ کثیر زیادہ متداول اور
ٹکسالی ہے۔ چنداں قابلِ حرف گیری نہیں مگر نجومِ کثیر آورد لفظی
اور غرابت کے عیب سے خالی نہیں۔ بہتر ہوتا کہ یہاں کثیر کو قافیہ
قرار دیا جاتا۔

زمانہ ایک خنکی میں یونہی با چشمِ نم گزرا

یہاں زمانہ ایک کی جگہ ایک زمانہ اور چشمِ نم کی جگہ چشمِ پرنم کہنا لازم تھا۔
نم بمعنی تری ہے مگر یہاں تر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

الف۔ گاؤں سارا گوالیوں کا ہے محوِ سکوت اب کچھ ایسا
ب۔ چلے ہو تاروں کی چھاؤں میں کیوں عدم کی طرف
ج۔ پاؤں کو چومتی کوئی ہیجانِ شوق میں۔

گوالیوں کی جگہ گوالوں زیادہ فصیح ہے۔ گاؤں چھاؤں پاؤں
کا تلفظ فصحائے حال فاع کے وزن پر لاتے ہیں۔ مگر یہاں تینوں
لفظ فعلن کے وزن پر ہیں۔

دنیا کو سمجھتا ہے سرائے کی طرح جو دمثلِ مسافر گذران ہوتا ہے

سرائے فارسی لغت میں گھر کا مترادف ہے۔ اسے مغلق اور فارغ کے وزن پہ یعنی دونوں صورتوں میں لکھتے ہیں۔ مگر اس شعر میں یہ لفظ ہندی ہے یعنی مسافروں کی منزل گاہ۔ اس کو مغلق کے وزن پہ باندھنا درست نہیں۔ یا تو یائے مجہول کے بغیر (سرا) کہنا تھا۔ یا اسے فارغ کے وزن پہ لانا تھا۔

کیا شان ہے فرش آسمان کی چنیاں ہیں جوڑی ہوئی سنہری

چنیاں میں نون مشدد ہونا چاہیے۔

حیرت افزا ہیں ہیبت چیل کے اشجار بلند

یہاں لفظ چیل پنجابی لفظ ہے۔ اردو میں چیڑ کہتے ہیں

۱۔ رخصت اجودھیا سے وہ جہاں جہاں ہوا

۲۔ گویا ہوا کہ اہل اجودھیا سنو تمام

لفظ اجودھیا کا صحیح تلفظ اردو میں کیا ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص سند ملنی دشوار ہے۔ استعمال کرنے والوں کو کوئی ایک تلفظ منتخب کر لینا چاہیے۔ جو ان کے خیال میں کثیر الاستعمال اور ثقالت سے پاک ہو۔ (ہمارے خیال میں پہلا استعمال ثقیل ہے) یہاں دو مصرعوں میں اس کے دو تلفظ مختلف نظم ہوئے ہیں۔ یہ اختلاف نامناسب ہے۔

ان مزد گذاشتوں کے علاوہ قوافی میں بھی کہیں کہیں ایطا موجود ہے مثلاً

نخل کھڑے ہیں سر کو جھکائے دستِ دعا شاخوں نے اٹھائے

اور صفحہ ۱۲۶ پہ آب و حیات کے قوافی بھی ہیں۔ مگر اس قسم کے سقم لاابالیانہ طرز خرام سے منسوب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ حضرت محروم قدمائے

کی روش کے دلدادہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور جناب داغؔ اور امیرؔ کے عہد میں بھی اس سقم کو چنداں درخورِ اعتناء نہ سمجھا جاتا تھا۔

خدمتِ فن کے خیال اور منصفانہ اظہار رائے کے غرض سے بمجبور ہو کر جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے۔ اسے محض بر سبیل تذکرہ سمجھنا چاہیے۔ اس تنقید کا اصل حصہ جو کلام مرحوم کی معنوی خوبیوں کا متعارف ہے، اور جن کا اظہار ہمارا حقیقی مدعا ہے۔ اب یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ان خوبیوں کی تفصیل سے اہلِ نظر بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ مرحوم صاحب اس عزت و شہرت کے ہر طرح مستحق ہیں۔ ایک شیوا بیان اور شیریں رقم شاعر کی ہستی خاص کر اس صورت کہ ادب برائے زندگی اس کا مطمحِ نظر ہو اور پاکیزگی کلام اس کا خاص جوہر ہو۔ دنیائے ادب کے لیے باعث فخر و مباہات ہونی چاہیے۔ اس وقت دنیائے ادب میں جو شہرت حاصل ہے۔ خدا کرے کہ وہ اس سے بھی زیادہ ناموری اور امتیاز حاصل کریں۔

گنجِ معانی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو پاکیزہ خیالات و جذبات کا آئینہ نہ ہو یا جو کسی خاص گروہ یا کسی خاص شخص کے لیے باعثِ دل آزاری ہو۔ اما دیت اس کلام کا سب سے بڑا عنصر ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی بشرطیکہ وہ اردو نظم کا ذوق رکھتی ہوں۔ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھ کر مستفید اور محظوظ ہو سکتی ہیں۔

اس مجموعے میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں۔ جن کے عنوان بالکل نئے ہیں۔ مثلاً آندھی۔ سندھ کو پیغام۔ عالم آب۔ بچے کی مسکراہٹ۔

مارِ آستینی ۔ ویران کٹیا ۔ پنجاب کے میدان ۔ خدا کی امانت ۔ جگانے کی گھڑی ۔
اس کے علاوہ قطعات و رباعیات ۔ غیر زبانوں کے قیمتی مضامین
کا منظوم ترجمہ نوحے وغیرہ بھی ہیں ۔ چند صفحات گلستاں کے
منظوم ترجمے کے لیے وقف ۔ کیے گئے ہیں ۔ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا
بالخصوص اس بحر میں صنعت سے خالی نہیں مثلاً

کیا نام دار زیرِ زمین دفن ہو چکے ۔ ہستی کا جن کی روئے زمیں پر نشاں نہیں
اس پیر لاشہ کو جو کیا دفن خاک میں ۔ یوں خاک کھا گئی کہ کوئی استخواں نہیں
زندہ ابھی ہے عدل سے نوشیرواں کا نام ۔ مدت ہوئی اگرچہ کہ نوشیرواں نہیں

یہ ترجمہ اصل بحر اور وزن کو برقرار رکھکر کیا گیا ہے ۔ ہمارے خیال
میں اس سے بہتر اور ہموار ترجمہ اس پابندی کے ساتھ نظم میں نہیں ہو سکتا ۔
شمع سحر کے عنوان سے ایک مسدس لکھا ہے اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ۔

اے شمع تیری رونقِ بازار کیا ہوئی ۔ گرمئ ذوق و شوقِ خریدار کیا ہوئی
وہ آب و تابِ جلوۂ رخسار کیا ہوئی ۔ وہ شب کدھر وہ بزم پر انوار کیا ہوئی
کیا ہو گئے وہ ناز وہ انداز کیا ہوئے
وہ سنھے سنھے عاشقِ جانباز کیا ہوئے

شب بھر ہو غریب تختۂ مشقِ ستم رہے ۔ لیکن امیدوارِ نگاہِ کرم رہے
مر کر بھی راہِ عشق میں ثابت قدم رہے ۔ جل کر گرے تو یار کے قدموں پہ ہم رہے
ہیں مہربانیاں فلک دوں نواز کی
یوں منتشر ہے خاک شہیدانِ ناز کی

یہ دونوں بند بہت شاندار کہے ہیں ۔ ہر ایک مصرعہ پختہ کلامی اور
منطقی سخن کا ثبوت دیتا ہے ۔ کوئی لفظ بیکار نہیں کوئی لفظ زائد

ہنیں۔ ہر ایک بند میں چاروں مصرعے برابر برابر تول کے ہیں۔ ٹیپ
کے شعر دونوں بندوں میں اپنے متعلقہ اشعار سے اس قدر مربوط ہیں
کہ بالکل دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ یہی دو چیزیں مسدس میں
خوبی اور حسن پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ دو ننھے ننھے عاشق جانباز
کیا ہوئے اس مصرعے کی داد کہاں تک دی جائے۔

بہت سی تلاش کے بعد جب رام سیتا کو نہیں پاتے تو یوں گویا ہوتے ہیں

کہسار میں وہ آئینہ سیما نہیں ملتا — صحرا میں کہیں نقشِ کفِ پا نہیں ملتا
گلزار میں اپنا گلِ رعنا نہیں ملتا — دریا میں بھی وہ گوہرِ یکتا نہیں ملتا

پہلے بھی تھا ویرانے میں کاشانہ ہمارا
اب اور بھی ویران ہوا ویرانہ ہمارا

اشجار مجھے اس کا پتہ کیوں نہیں دیتے — پتوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے
مرغانِ ہوا تم ہی بتا کیوں نہیں دیتے — سیتا پہ جو گزری ہے سنا کیوں نہیں دیتے

پھرتا ہوں نہیں دم کوئی بھی فریاد رسی کا
سچ ہے کہ نہیں کوئی مصیبت میں کسی کا

یہ کہنا کہ ان دونوں بندوں میں انیس کی روح بول رہی ہے۔ ذرا بھی
مبالغہ نہیں۔ کہسار کے لیے آئینہ سیما۔ صحرا کے لیے نقشِ کفِ پا۔
گلزار کے لیے گلِ رعنا۔ دریا کے لیے گوہرِ یکتا۔ کیسے روشن مناسبات ہیں۔
گلِ رعنا اور اپنا گلِ رعنا۔ اس اندازِ بیان کو کیا کہیے۔ پتوں کو زبان سے
نسبت مستور ہی نہیں بلکہ یہ تشبیہہ مسلمہ ہے۔ ایک ایک مصرعہ حسنِ بیان
کی تصویر ہے۔ ادبیات کا تناسب دیکھیں۔ ٹیپ بند کا شعر کس قدر

حسب لکھا ہے۔ دوسرے بند میں بھی چاروں قافیے بہت چست
ہیں۔ اور باوجود اس خوبی کے وہ بے تکلفانہ نشر ہیں یہ خوبی پیدا کرنا
آسان نہیں۔ اس محل پر مرغانِ ہوا کو مخاطب کرنے کا خیال نہایت
قابلِ داد ہے۔ کیونکہ اوجِ پرواز کی وجہ سے وہ دور دور تک
نظر دوڑا سکتے ہیں۔ اس قسم کی تمناؤں کے بعد آدمی آخر مایوس ہو جاتا ہے۔
بند کا شعر اسی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ دونوں بند پڑھ کر تمام اہلِ
ذوق خوش گفتنی و درستی کہنے پر مجبور رہوں گے۔

دریا کی طغیانی پر عالمِ آب کے عنوان سے ایک ترجیع بند
لکھا ہے۔ اس کے یہ دو حصے قابلِ غور ہیں۔

قریہ در دہ میں دکھاتا ہے روانی پانی — گلی کوچوں میں خرابی کا ہے بانی پانی
گاؤں والوں کا ہوا دشمنِ جانی پانی — غرض آبادی و ویرانہ ہے پانی پانی
ہر کجا می نگرم عالمِ آب است ایں جا

پانی رک رک کے ہوا جاتا ہے بے تاب کہیں — موجیں اٹھتی ہیں کہیں اور ہے گرداب کہیں
کہیں ایک زور کا ریلا ہے تو سیلاب کہیں — تا بہ گردن کہیں اور ہے پایاب کہیں
ہر کجا می نگرم عالمِ آب است ایں جا

پہلے بند میں قافیوں کا حسن (چوتھے مصرعے کے سوا یہاں پانی ہی پانی
کہنا مناسب تھا) ملاحظہ ہو۔ دوسرے مصرعے میں لفظ خرابی بھی قابلِ داد ہے
ان مصرعوں میں جو باہمی ربط ہے وہ پانچویں مصرعے کی شان کو دوبالا کر رہا
ہے۔ ان ظاہری باتوں کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ قابلِ داد ہے۔
وہ ان مناظر کی تفصیل ہے۔ جس میں واقعات اور مشاہدات کے نتائج
کی تطبیق پورے طور پر نظر آتی ہے۔ اور [illegible] پڑتا ہے کہ [illegible] قوتِ بیانیہ

کے اظہار میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔

گنگا پر ایک نظم لکھی ہے۔ اس کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

نورِ سیال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو | حیرت افروز دل و دیدہ حیراں ہے تو
کس دل آویزی و تیزی سے خراماں ہے تو | مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو

حسن بے تاب نمائش سے پشیماں کیوں ہے
پردہ رخ ترا جلوہ ہے گریزاں کیوں ہے

مخدوم صاحب کے کلام میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ ہر ایک مضمون پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اظہار خیالات کرتے ہیں۔ اور سخن گسترانہ انداز کو کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تمام نظم کہنے والے شعرا میں یہ وصف ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر انداز بیان شاعرانہ نہ ہو تو اس نظم سے نثر بدرجہا بہتر ہے۔ اس بند میں جو اندازِ تغزل پیدا کیا گیا ہے وہ نہ صرف قابلِ ستائش ہے بلکہ ہر ایک نظم گو کے لیے قابلِ تقلید بھی ہے۔ مصرعہ اول میں دونوں تشبیہیں بہت نادر اور نہایت خوبصورت ہیں۔ ان کی لطافت اور جدت مصنف کے لیے ہر لحاظ سے مایہ صد افتخار ہے۔ دوسرے مصرعے میں حیرت افروز کی ترکیب بجائے خود گنجِ معانی ہے۔ مجھکو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو۔ اس مصرعہ کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ یہ خیال آرائی کا نگار خانہ ہے۔ اتنی مضمون آفرینی اور اس قدر جدت خیال کے باوجود مصرعے اس قدر ہموار اور بے ساختہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ غرض کس کس چیز کی داد دی جائے۔ ان دلکش مصرعوں کے بعد بند کا جو شعر کہا گیا ہے وہ سراپا تغزل ہے۔ مثنوی شعر کی تعریف میں ایک تقریظ منظوم کہی ہے۔

اس کے یہ شعر کتنے پختہ اور ٹھوس ہیں۔

جاں بخش بھی دل گداز بھی ہے ۔۔۔ سوز بھی اس میں ساز بھی ہے
نغمے ہیں سرور پاش اس میں ۔۔۔ نالے ہیں جگر خراش اس میں
جلوے ہیں کہیں اس میں بزم کے ہیں ۔۔۔ نقشے ہیں کہیں اس میں رزم کے ہیں
امکاں کا ہے گو ظہور اس میں ۔۔۔ عرفاں کا بھی ہے سرور اس میں

جاں بخش اور دل گداز یہ دونوں متضاد اوصاف ثابت کرنے کے لیے جو مصرعے لگائے گئے ہیں۔ اس سے بہتر کوئی اور صورت خیال میں نہیں آسکتی۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں ترصیع کامل کا پورا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ چاروں شعر مصنف کی مشق سخن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔
جگر بریلوی کی ایک غزل پر تضمین کی گئی ہے۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔

دامنِ زلیت چاک ہونے دے ۔۔۔ قصہ ہوتا ہے پاک ہونے دے
خاک کو تابناک ہونے دے ۔۔۔ راہ میں اپنی خاک ہونے دے

اور کچھ میرا التماس نہیں

اس بند میں زبان کی صفائی مصرعوں کی ہم آہنگی اور تضمین کی خوبی غرض ہر چیز لاثانی ہے۔ تینوں مصرعوں سے اصل شعر کے مضمون کو جو ربط ہے اور جو زور پیدا کیا گیا ہے۔ وہ قابلِ داد ہے۔ رباعیات جتنی لکھی گئی ہیں۔ ان میں حسنِ بیان اور خوش کلامی کا رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جو کچھ لکھا ہے۔ ایک رنگ میں لکھا ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں۔ جہاں کوئی نکتہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو مثلاً

دنیا میں برائے مردم کم مقدار ۔۔۔ اصلِ شو کتنہ ہیں باعثِ صد آزار

راہوں میں رہروانِ منزل کے لئے   اُڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار

مغرور اہلِ زر بیچارے غریبوں سے جو سلوک کرتے ہیں۔ اسے
ہر شخص جانتا ہے اور ہر روز مشاہدہ کرتا ہے۔ اس موضوع پر
ایک دو رباعیات نہیں بلکہ صدہا دردناک نظمیں لکھنے کی ضرورت ہے۔
محروم صاحب نے کس قدر حق گوئی سے کام لیا ہے۔ اور اس کے لیے جو مثال
تلاش کی ہے۔ وہ حسنِ تلاش کا بہترین ثبوت ہے۔ شاعرانہ حسنِ بیان
کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ پیش افتادہ واقعہ سے کیا بات پیدا کر دی ہے۔

ہمارے خیال میں اس تصنیف منیف معرکۃ الآرا حصہ وہ ہے
جس میں حضرت محروم کی وہ ماتمی نظمیں شامل ہیں۔ جو انہوں نے اپنی
اہلیہ محترمہ کی وفات الم آیات پر لکھی ہیں۔ ان نظموں میں واقعہ نگاری
کا وہ کمال دکھایا ہے کہ باید و شاید۔ سبحان اللہ کتنے دردناک اور تاثیر
میں ڈوبے ہوئے مضامین نکالے ہیں۔ کسی خاص سلسلے کا خیال چھوڑ
کر متفرق مقامات سے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ پہلی نظم کو
اس طرح شروع کیا گیا ہے۔

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری   ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمہاری وہ حرزِ غمخواری   گر بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی
چھیڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

یہ بند کتنا رقت انگیز ہے۔ مرثیت کی کون سی بات ہے جو اس
میں نہیں پائی جاتی۔ ہندو عورتوں کا کیریکٹر کس خوبی سے بیان کیا ہے
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی۔ یہ مصرعہ کس بلا کا ہے۔ کلیجہ تھام لینا

پڑتا ہے۔

کیا تھا عہدِ وفا تجھ سے عمر بھر کے لیے

ابھی سے ہو گئے تیار کیوں سفر کے لیے

اس شعر میں وہ عہد وفا یاد دلایا گیا ہے جو ہندوؤں کے یہاں شادی کی تقریب کا ضروری حصہ ہے۔

گذر نے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی

شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی

ہے یاد مجھکو وہ پرسوں کی زیرِ لب فریاد

تمہاری آہ جگر سوز پر تعب فریاد

دل و جگر یہ مرے ڈھا گئی غضب فریاد

کہ کرنے والے نہ تھے تم تو بے سبب فریاد

نظر اٹھاؤ ذرا میری چشم نم کی طرف

بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف

خیال میرے دل دردمند کا کرنے

شریک شادی و غم تھے تو پھر وفا کرنے

جو چھت سے بچہ کنجشک کوئی آن گرا

اٹھا اٹھا کے اسے تم نے آشیاں میں رکھا

کسی سے کرتے نہیں بات وا اسفا   نہ تھے تم ایسے تغافل صفات وا اسفا

دھرے ہی رہ گئے نبضوں پر ہاتھ وا اسفا   کٹے گی کس سے یہ ماتم کی رات وا اسفا

سدّل بھر کی شیر خوار بچی کے متعلق اسی سلسلہ میں مفصلِ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں۔

لو اٹھو کہ بیٹھو کہ ددّیا سرہانے آئی ہے — تمہارے منہ سے وہ دامن اٹھانے آئی ہے

وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہوگی — تمہارے پیار سے پھر اس کو تازگی ہوگی

اٹھا بھی لو کہ بہت بے قرار ہے ددّیا — نہ چھوڑ جاؤ اسے شیر خوار ہے ددّیا

پکارتی ہے تمہیں آج کس قرینے سے — ابل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے میں

گھٹنوں پہ چل کے نعلی بستر کے پاس پہنچی
ننھے سے دل میں اپنے کچھ لے کے آس پہنچی
کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اٹھا کر
منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچے وہ لد لدا کر
ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے
پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے
مردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے
کچھ سخت حال پہ یارب یہ کیا گذر رہی ہے

اس مقام پر پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے۔ کہاں تک لکھیں۔ دل بھر آتا ہے۔ قلم بھی اشک بار ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ اشعار کس دل سے نکلے ہیں۔ اور اس روح فرسا مصیبت میں یہ لاجواب نظم کیونکر لکھی گئی ہے۔ اخیر میں ہم جناب مرحوم کو گنجِ معانی کی ترتیب و اشاعت پر دوبارہ مبارکباد کہہ کر اس تنقید کو ختم کرتے ہیں۔ اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ طوالت کے خیال سے اپنی رو داد پوری نہ دے سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ تمام اہلِ ذوق کو اس پاکیزہ کلام کی قدر کرنی چاہیے۔

شعاعِ مہر

عمدۃ الشعراء پروفیسر نارائن پرشاد ورما جانشین داغؔ مرحوم کا مجموعہ کلام فصاحت التیام شعاعِ مہر کے نام سے آسمان ادب پر طلوع ہوا رہنمائے تعلیم کے گذشتہ نمبر میں ایک قطعہ تاریخ اس دیوان کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی خبر ناظرین تک پہنچانے کے لیے راقم الحروف نے شائع کیا تھا اور جس کا مادہ تاریخ یہ تھا۔

حسنِ معنی کی تجلی نظر آئی کیا کیا (۱۹۹۴ ہجری۔)

مقام مسرت ہے کہ اب وہ دیوان نہایت آب و تاب سے اشاعت پذیر ہو گیا ہے۔ جناب مہرؔ کے کلام پر کسی طویل تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے افکار عالیہ کئی دفعہ نذر ناظرین ہو چکے ہیں۔ ایک خاص نمبر میں موصوف کے سوانح زندگی بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جناب مہرؔ کا انداز بیان اپنے استاد جناب داغؔ مرحوم کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی استادانہ بندشیں اس قدر پختہ اور بے ساختہ ہوتی ہیں کہ طبیعت خود بخود داد دینے

پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ان کے بہت سے اشعار میں حسن بیان اور

لطفِ زبان کی وہ خوبیاں نظر آتی ہیں کہ ان پر داغؔ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

متروکاتِ زبان اور متروکاتِ شعری کے لحاظ سے بھی موصوف کا کلام ہر نو آموز کے لیے ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔ وہ نازک سے نازک مضامین کو اس صفائی اور اس خوبی سے بیان فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ حسنِ بیان خیال میں نہیں آ سکتا۔ تخفیف و ثقالت کی یہ احتیاط بھی کتنی قابلِ داد ہے کہ بسمل کا ہے قاتل کا ہے اس زمین میں جو غزل ایک مشاعری کی طرح تکمیل کے لیے بہ طرز فرمائش کہی دیوان میں اس لیے شامل نہیں فرمائی کہ ردیف میں الف کی تخفیف ہوتی ہے اور کا حرفِ اضافت کاف ہی تلفظ میں آتا ہے۔

اس دیوان کی ضخامت ۲۷۰ صفحات کی قیمت دو روپے ہے۔ ابتدائی حصہ میں ان سندات کی نقول بھی شامل کی گئی ہے۔ جو بطور اعزاز جناب مہرؔ صاحب کو حاصل ہو چکی ہیں۔ اور جن کے وہ بجا طور پر مستحق بھی ہیں۔ مثلاً سند جانشینی داغؔ اور سند خطاب عمدۃ الشعراء جناب سائلؔ دہلوی کی طرف سے وغیرہ وغیرہ۔

ان سندات سے اگرچہ جناب مہرؔ کی شخصیت دنیائے شعر و سخن میں بہت نمایاں اور مقتدر نظر آتی ہے لیکن حق یہ ہے کہ ان کا کلام بلاغت نظام اس معیار اور اس پائے کا ہے کہ اس کی آب و تاب سے سندات کی زینت ہوتی ہے۔ سندات کی آب و تاب سے کلام کی زینت نہیں ہوتی۔ نمونہ کلام کے لیے صرف ایک غزل کے چند اشعار نقل کر

دنیا کافی ہے۔ انہیں چند اشعار سے یہ حقیقت عالم آشکارا ہو جاتی ہے کہ جناب مہر کی عظمت دربار سخن میں کیا ہے۔

اب کہاں مجمع امید و تمنا دل میں ‏ ‏ ایک رہنے نے تمہے کچھ بھی نہ رکھا دل میں
یہ بھی کہنا کہ کرو صاف دل اپنا ہم سے ‏ ‏ اور پھر یہ بھی کبھی صاف نہ ہونا دل میں
دل جو لے لیں گے تو کس دل سے یہ چاہے گا ہمیں ‏ ‏ ہم نے گھر پھونک کے دیکھا یہ تماشا دل میں
ضبطِ فریاد و فغاں پر بھی کسی نے نہ کہا ‏ ‏ چپکے چپکے بجھے پھر آپ نے کوسا دل میں
جان جب جسم میں آئی تو محبت آئی ‏ ‏ ساتھ ہی دل کے ہوا درد بھی پیدا دل میں
سرخ آنسو مری آنکھوں میں نظر آتے ہیں ‏ ‏ کر دیا یاس نے کیا خونِ تمنا دل میں

مجموعہ غزلیات کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن کی صورت میں چھ مسدس ہیں مسرت و الم کی تقریبوں پر کہے ہیں۔ ان کے بعد چھ مخمس ہیں۔ جو مختلف شعرائے نامور کی غزلوں پر نہایت خوبی سے کہے ہیں۔ مثلاً حضرت داغ کی غزل کا ایک شعر یہ تھا۔

تمہاری بات زمانے میں کھل ہی جاتی ہے
یہ بات کیا ہے کہ اس کی خبر نہیں چھپتی

اس شعر کی تخمیس ملاحظہ ہو۔

بشر چھپائیں تو بلبل اسے سناتی ہے ‏ ‏ جو وہ چھپائے تو لب پر گلوں کے آتی ہے
چھپائیں گل بھی تو کیا کیا صبا اڑاتی ہے ‏ ‏ تمہاری بات زمانے میں کھل ہی جاتی ہے
یہ بات کیا ہے اس کی خبر نہیں چھپتی

اسی طرح بیخود دہلوی کی غزل پر مخمس کہا ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

فریفتہ یہ دلِ بے قرار کس کا ہے ‏ ‏ یہ ذکر لب پہ مرے بار بار کس کا ہے

اس مطلع کی تخمیس یہ ہے۔

خدنگِ ناز مرے دل کے پار کس کا ہے ‏ ‏ شکار کس نے کیا ہے شکار کس کا ہے

بتائے کون مجھے جاں نثار کس کا ہے   فریفتہ یہ دل بے قرار کس کا ہے
یہ ذکر لب پہ مرے بار بار کس کا ہے

ان دونوں نمونوں کا ملاحظہ کرنے کے بعد یہ اندازہ کرنا آسان ہے کہ حضرت مہر کا پایۂ سخن کیا ہے۔

اس کے بعد تقریبی نظمیں ہیں۔ یعنی مبارکبادیاں اور سہرے وغیرہ۔ سہروں کی تعداد معقول ہے۔ ایک ہی مضمون پر اس قدر وسعت خیال حضرت مہر کی جولانیِ طبعیت کا روشن ثبوت ہے۔ کچھ رباعیاں اور قطعات تاریخ ہیں۔ بعض تاریخیں مختلف صنعتوں میں اس خوبی سے کہی ہیں کہ انہیں نادر گوئی میں شمار کرنا چاہیئے آخر میں: "قلیل الاستعمال محاورات اُردو کے متعلق متفرق اشعار ہیں جو ان محاورات کا صحیح استعمال بتانے کے لئے وقتاً فوقتاً کہے گئے" اس مجموعہ میں بھی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہم رہے وعدے کی شب بے تاب جس کے واسطے
وہ تو وعدے پر نہ آیا اور وعدا آگیا

اہل اُلفت کو ستاتے رہے کیا کیا   آپ نے صبر غریبوں کا سمیٹا کیسا
تصویر حسن رخ کی مانی بھی گر اتارے   لیکن رہے گی تم سے اُنیس بیس پھر بھی

کیوں نہ ہو پھر مہر میرے شعر میں سوز و گداز
میں نے چلمیں بھری ہیں داغ سے اُستاد کی

⁂

نیچے کبھی تو اپنی کوئی بات ڈالیے
یہ کیا کہ بات بات میں حجت نکالیے

الغرض یہ دیوان رشحاتِ مہر اپنے جملہ محاسن ظاہری و
باطنی کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کی اشاعت کے لیے
دنیائے ادب جناب مہر کا دلی شکریہ ادا کرے اور اس
دیوان کے متعدد ایڈیشن شائع ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔

سوز و گداز

ناگپور کے کہنہ مشق مزاح نگار شاعر جناب حافظ محمد ولایت اللہ صاحب حافظ کا مجموعہ کلام "سوز و گداز" کے نام سے محبوب المطابع دہلی میں زیور طبع سے مزین ہو کر حال ہی میں دنیائے ادب کے سامنے آیا ہے۔ حسن ظاہر کی آراستگی اور حسن طبیعت کی پیراستگی ایک دوسرے سے تحسین طلب کر رہی ہیں۔ حافظ صاحب اگرچہ اس خطہ کے رہنے والے ہیں جہاں اُردو بازار کی گرم بازاری بہت کم ہے۔ اور دوران ملازمت میں بھی انہیں ایسے مقامات میں قیام پذیر ہونے کا اتفاق ہوا جہاں اُردو ادب اور اُردو شاعری کا کوئی چرچا نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود ان کا کلام بلاغت نظام صحت زبان اور بے تکلفی بیان کے لحاظ سے بہت پختہ ہے۔ بہت دلکش اور قابل داد ہے۔ فصحائے حال کے متروکات مثلاً یاں واں اس جا کیسے یہ معنی کیوں کہ جائے بہ معنی جگہ اگرچہ کہیں کہیں نظر آتے ہیں مگر حسن سخن ان الفاظ پر متوجہ ہونے کا موقع بہت کم دیتا ہے۔

اس مجموعہ میں قصائد غزلیات قومی اور اخلاقی نظمیں تخمیس مثنویاں وغیرہ ہر قسم کا کلام موجود ہے اور اس تنوع سے ظاہر ہوتا

ہے کہ حافظ صاحب کی طبیعت جملہ اصناف سخن پر بخوبی قادر ہیں مگر
حق یہ ہے کہ اس کتاب کا حصہ مزاحیات جو صفحہ ۱۴۱ سے شروع ہو
کر صفحہ ۲۲۷ پر ختم ہوتا ہے بہت معرکتہ آلارا ہے۔ شوخ نگاری
ظرافت اور زندہ دلی جو مصنف کی طبیعت کے جوہر ہیں۔ اس سے
حصے میں آپ کو بہت نمایاں نظر آئیں گے۔ ان مزاحیہ مضامین میں ایک
خاص وصف یہ ہے کہ پند و نصائح کے انداز میں مشرقی اخلاق مشرقی
سادگی اور مشرقی تہذیب کی تلقین جا بجا کی گئی ہے۔ مغربی فیشن اور
مغربی تہذیب کی جھوٹی تقلید نے جو خرابیاں ہمارے نوجوانوں مردوں
اور عورتوں میں پیدا کر دی ہیں۔ اور جن کا زہریلا اثر روز بروز
ہمارے خون میں سرایت ہو رہا ہے۔ ان مہلک نتائج نہایت دلکش
انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر
اکبر مرحوم یاد آ جاتے ہیں۔ سیاسی نظموں اور متفرقات میں بھی یہ عنصر
بہت غالب نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کی چابک
رفتاری حضرت اکبر مرحوم کی شاہراہ سخن پر چلنا زیادہ پسند کرتی ہے۔
بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی شاعری اور خوش گفتاری کا خاص میدان
یہی ہے۔ غزلیات میں بیشتر اشعار ایسے موجود ہیں جنہیں شوخ نگاری
اور ظریفانہ انداز بیان کا یہ خاص رنگ دوسرے اشعار سے ممتاز کر
رہا ہے۔ ظرافت نگاری میں طبیعت کو زیادہ آزاد اور کھلا چھوڑ دیا جائے
تو محتاط سے محتاط شاعر کا قلم بھی بعض ایسے اشعار لکھ جاتا ہے۔
جن میں بیان کی عریانی قابل انگشت نمائی ہوتی ہے۔ اکبر غالب بلکہ
سعدی کے کلام میں بھی اس قسم کی عریاں مثالیں ڈھونڈنے والوں کو

کم و بیش مل جائیں گی۔ مگر حافظ کے تمام مزاحیہ کلام میں ایسی کوئی خاص مثال نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا کلام شوخ نگاری میں بھی جادۂ اعتدال سے منحرف یا متجاوز نہیں ہوتا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قلابازی دکھائی لیڈروں نے بزمِ قومی میں
تماشا ہے سیاسی راستے میں ہر وقت سرکس کا
نہیں ہے اب ضرورت قیس کو صحرانوردی کی
کہ لیلےٰ کی طرف سے کارڈ آتا ہے کرسمس کا

٭

نہیں ہے شوق باقی شیخ کو نانِ تنوری کا
مزہ بھولا برہمن بھی کچوری اور پوری کا

٭

ہیں ٹیلیفون میں سرگوشیاں لیلےٰ و مجنوں کی
خوش قسمت جدائی میں نہیں ہے رنج دوری کا
تپِ فرقت میں ہر تریاق اک زہر ہلاہل ہے
اثر برعکس ہے بیمار شربت بزوری کا

٭

فصلِ گل میں قیس و لیلےٰ کا جنوں ہم وزن ہے
ساتھ جاتے ہیں کرسمس میں بیاباں کی طرف
جیب میں پتلون کے رہنے لگے مجنوں کے ہاتھ
ان کو فرصت ہی کہاں جائیں گریباں کی طرف

ان اشعار میں گرامیٔ کلام اور قوافی کا اہتمام ملاحظہ فرمائیں۔ سرکس کے ساتھ لفظ قلابازی کتنا ضروری اور اہم ہے۔ مصنوعی اور خود مطلب لیڈروں کا تلوّن ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں مل سکتا۔ کچوری اور پوری کے ساتھ نان تنوری کا تناسب قافیہ خوب سوجھا حسن تلاش اسی کا نام ہے۔ آخری شعر کے مصرع ثانی کی داد کہاں تک دی جائے۔ ان کو فرصت ہی کہاں ان الفاظ میں قیس کے جنون کا جوش کتنا متلاطم ہے، اسے اصل ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اب حالات حاضرہ کے زیر عنوان چند اشعار ملحوظ ہوں۔

بیبیوں کا حجاب ہے غائب	ان کے منہ سے نقاب ہے غائب
غور سے شیخ و شاب کو دیکھو	خوف روز حساب ہے غائب
لیڈروں کی زبان پہ ہے درد	قلب میں اضطراب ہے غائب
ان کی اسکیم ایک خیمہ ہے	جس کی ہر اک طناب ہے غائب
چلتے ہیں سارے کام چندوں سے	صرف ان کا حساب ہے غائب
لسٹ چندوں کی چند روزہ ہے	لبد میں وہ کتاب ہے غائب
بند ہے میکدے میں سے نوشی	گھر میں سب اجتناب ہے غائب
ضبط کی تھی بھری ہوئی بوتل	لیکن اس کی شراب ہے غائب

اس قسم کی زمین میں جیسے اور شگفتہ اشعار کہنا آسان بات نہیں۔ معنی آفرینی کی شان کو دیکھنا ہو تو طناب کا قافیہ دیکھیے۔ اس کے ساتھ "ہر اک" نے کتنا زور بیان پیدا کیا ہے۔ حساب کے قافیے میں پہلا لفظ صرف کتنا ظریفانہ اور شوخ واقعہ ہوا ہے۔

شراب کا قافیہ جن لوگوں کے لیے آیا ان کی ستم ظریفی اور خیاری نہایت
محتاط الفاظ میں کتنی جامع مذکور ہوتی ہے۔ انگریزی کے متعارف
الفاظ ایسے سلیقے سے استعمال کیے گئے ہیں کہ شعر میں مغائرت
پیدا نہیں ہوتی۔ اتنی چھوٹی سی بحر اور تنگ زمین میں اشعار کی یہ
کیف انگیزی و دل آویزی یہ لطف زبان یہ حسن بیان ہر لحاظ اور
ہر پہلو سے قابل داد ہے اور سنیئے۔

ڈر ڈر کے شیخ پڑھتے ہیں لاحول آجکل
شیطاں کے پاس رہتا ہے پستول آجکل

لاحول سے شیطان بھاگتا ہے۔ مگر جب اس کے ہاتھ میں پستول
ہو تو اسے ڈر کس کا۔ ایک طرف مذہبی عقیدہ ایک طرف جان کا
خوف۔ دونوں کے تصادم سے عقیدے کا متزلزل ہو جانا فطرت
انسانی کی صحیح تصویر ہے۔ مطلع کی روانی اور چستی بیان کی بے تکلفی
اور قوافی کی نشست کا کیا کہنا۔

تردد میں پڑا ہے ناخدا کچھ بن نہیں پڑتا
سمندر سے زیادہ ڈوبتے ہیں لوگ بوتل میں

ڈوبنے کے اس مجازی استعمال کی داد کون دے سکتا ہے۔ ناخدا
کی معنویت پر بھی ذرا غور کیجئے۔ مصرع ثانی نے اس شعر کو کہاں
سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ تاثیر کلام مزید براں۔

ٹکٹ کے نرخ سے لیلےٰ و مجنوں دونوں نالاں ہیں
سکھائے ہیں ستم کس نے خدایا ڈاک خانے کو
جوابی کارڈ جو مجنوں کو دو پیسے میں ملتا تھا
اسے اب ڈاک خانہ دے رہا ہے ڈیڑھ آنے میں

کارڈ کی جگہ جوابی کارڈ کا مذکور کتنا پُر لطف اور پُر معنی ہے۔
دونوں شعروں میں بیان کی ہمواری قابل دید ہے۔

مقدر میں ہے شانِ اسیری خط میں بھی قائم
ہمارا نام جب لکھا تو ظالم نے بریکٹ میں

اس انگریزی قافیہ کی شگفتگی و برجستگی کے ساتھ تلاش مضمون کا اندازہ کیجیے اور جدت خیال کی داد دیجیے۔ لفظ شان میں جو طنز ہے اس کی لطافت بھی قابل غور ہے۔

ہریجن کی کہیں سلجھی کہیں مزدور کی سوجھی
جہاں فاقہ کیا گاندھی نے اس کو دور کی سوجھی
جنابِ شیخ کے افکارِ عالی کا بیاں کیا ہو
کبھی جنت کا ذکر آیا تو ان کو حور کی سوجھی

* * *

شیخ جی بیٹھے ہیں چرخا لے کے شیخانی کے ساتھ
کاتتے ہیں سوت دن بھر اپنی دیوانی کے ساتھ

* * *

ہے نرالا یہ سودیشی کا طریقہ آپ کا
کوٹ ہے کھادی کا سگرٹ منہ میں قینچی چھاپ کا

* * *

جدت پسند قاضی و مفتی بھی ہو گئے
ہر روز اختصار ہے اب درسِ پاک کا
مدت ہوئی کہ گیسوئے جاناں تھے مختصر
ہے اختصار دامنِ طرزِ فراک کا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

'شرق اختصار' کے عنوان سے جو نظم ارشاد ہوئی ہے۔ یہ تین شعر اسی میں سے ہیں۔ میر تقی میر کے مشہور شعر کی تضمین کتنی مربوط ہے۔ کتنی شگفتگی اور کتنی ظریفانہ ہے۔ لفظ جنوں نے یہاں شوخی بیان کا جو معنوی اعجاز دکھایا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اس قسم کا بہت سا انتخاب پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ کاغذ کی گرانی اور گرانی کے اثر سے تنگ دامانی "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کہنے کی اجازت دینے سے قاصر ہے۔

کتاب کے آخر میں حضرت سائل دہلوی اور خواجہ حسن نظامی کے قلم سے دو تقریظیں بھی شامل اشاعت ہیں۔ جن میں ہر دو مشاہیر نے مصنف کے حسن بیان کی خوب داد دی ہے۔

ان کے علاوہ ایک تیسری تقریظ مرزا عثمان اشرف گورگانی کے قلم اعجاز رقم سے ہے۔ یہاں اس کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی فروگذاشت ہوگی۔ یہ تقریظ ۳۸ تاریخی مادوں کا مجموعہ ہے۔ جو ایک ہی سنہ عیسوی سن ۱۹۴۱ع کے حامل ہیں۔ مرزا صاحب کا تاریخ گوئی کا یہ کمال اس گئے گذرے ادبی دور میں بڑے بڑے معجز نگار مورخوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ چند سطریں اس تقریظ کو انگشت بدنداں ہو کر ملاحظہ فرمائیں۔

حقائق آگاہ حافظ محمد ولایت اللہ صاحب — سنہ ۱۹۴۱ء
بی اے علیگ خاں بہادر آئی ایس او شاعر شستہ بیان و باکمال — ایضاً

سی پی کے حاکم عصر و صاحب عدل ڈپٹی کمشنر — سنہ ۱۹۴۱
میرے مخلص یگانہ و نہایت مہربان ہیں۔

ادیب پاکیزہ اساس حافظ صاحب کی عمر کا بڑا حصہ — ایضاً
علی العموم ہندوستان کے ایسے خطے میں گذرا ہے۔ — ایضاً
جہاں رونق علم و ادب و فصاحت زبان بالکل مفقود تھی
اس پر بھی عالی طبع فصیح البیان جناب حافظ صاحب کا
شوق سخن برابر جاری رہا۔

میں نے حافظ صاحب کا نادر و دلچسپ مجموعہ کلام دیکھا ہے
آپ کا رونق بزم کلام نتیجہ خیز اور پسند آمیز ہے
نہایت سلیس و جامع سادہ اور پُر اثر ہے۔
طبع ذکا مذاق پر مائل ہے۔
وغیرہ وغیرہ۔

امید ہے کہ تمام سخن فہم سخن شناس اصحاب اس نصیحت آمیز اور زندگی بخش مجموعہ کلام کو جو حضرت اکبر مرحوم کی زندہ جاوید شاعری کا ایک قلب دار عکس ہے۔ اپنے کتب خانے کی زینت بنائیں گے۔

تذکرہ بہارِ سخن

اس سے پیشتر یہ اعلان شائع ہو چکا تھا کہ خواجہ عشرت لکھنوی کے مرتب کردہ تذکرہ ہندو شعراء کے بعد ایک اور تذکرہ ہندو شعراء جسے نقشِ ثانی کہنا چاہیئے زیر طبع ہے۔ اور اسے بابو شیام سندر لال برقؔ بی۔اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ سیتاپور (اودھ) مرتب فرما رہے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ یہ جامع تذکرہ عرصہ وجود میں آکر اشاعت پذیر ہو گیا ہے۔ اس کا سائز $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ ہے۔ ۴۰۸ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ اس میں پانچ سو سے زیادہ ہندو شعراء کے ماضی و حال کا ذکر خیر ہے۔

دنیائے ادب اور اُردو زبان جناب برقؔ کی اس اولوالعزمی اور محنت شاقہ کے لئے ہمیشہ سپاس گذار اور مرہون منت رہے گی۔ اُنہوں نے اس پیرانہ سالی میں یہ گراں قدر و گراں روز خدمت گوارا کی۔ اسی دوران میں انہیں ضعف بصارت نے مجبور کر دیا۔ بلکہ معذور کر دیا۔ مگر اُنہوں نے اس دشوار گذار منزل کو کامیابی سے طے کیا۔ اور ایک ضخیم تذکرہ مرتب کر کے قدر شناسان سخن کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اگرچہ تذکرہ مرتب کرنے کی تجویز پر ان سے کہا گیا تھا کہ خواجہ صاحب نے تذکرہ ہندو شعراء کی صرف ۲۵ جلدیں چھپوائی

ہیں۔ اور وہ اس قلیل تعداد فروخت نہ ہونے کے شاکی پائے جاتے ہیں۔
اس کساد بازاری اور ادبی جمود کے عالم میں آپ کس توقع پر تذکرہ کی
ترتیب و تدوین کا عزم بالجزم کیئے ہوئے ہیں۔ باوجود اس اظہار
حقیقت کے جو نہایت حوصلہ شکن تھا۔ انہوں نے اپنی سرگرم کوشش
کو معرض التواء میں ڈالنا منظور نہ کیا۔ شعراء کے حالات اور کلام
جمع کرنے کے لیئے جن مشکلات و موانع سا سابقہ پڑتا ہے اسے کچھ
وہی شخص جانتا ہے جس نے یہ ہفت خوان عبور کیا ہو۔ بعض شعرا
کی ابالیانہ طبیعت تین تین چار چار خطوط لکھنے کے باوجود جواب
دینے کو زحمت گوارا نہیں کرتی۔ بعض عالم علوی کے باشندے مولف
تذکرہ کو اپنا مخاطب صحیح تسلیم کرتے سے انکار کر دیتے ہیں۔
ان حالات میں احباب کو تصدیعہ دینا پڑتا ہے کہ فلاں فلاں شعراء کے
حالات اور کلام فراہم کیجیئے۔ احباب میں بھی ایسے اصحاب بہت کم ہوتے
ہیں۔ جو خدمت فن کے خیال سے پرائی مصیبت میں پڑنا گوارا کریں۔
علاوہ ازیں ملک کے طول و عرض میں کئی خطے ایسے ہوتے ہیں کہ
وہاں اس قسم کی جان پہچان والے آدمی نہیں ملتے یا نہیں ہوتے
اس صورت میں مختلف رسالوں اور اخباروں کی ورق گردانی کرنے
یا سُنی سنائی باتوں پر اعتبار کر لینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر
نہیں آتا۔ زندہ شعراء کے حالات اور کلام فراہم کرنے میں یہ دشواریاں
ہوں تو مرحوم شعراء کے حالات زندگی اور منتخب کلام کی فراہمی میں جو
مشکلات حائل ہو سکتی ہیں۔ ان کا اندازہ آسان نہیں۔ ان مراحل سے گذر
جانے پر شاہد ہمت کے گراں [illegible] برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

امرا سے اتنی مدد نہیں ملتی کہ وہ اس کی طباعت ہی کا خرچ گوارا کر لیں
اور اس طرح مولف کی مشکلات کو آسان کر دیں۔ طرّہ اس پر یہ ہے کہ
ان ناقابل حل مشکلات کو حل کرنے اور ان تمام رکاوٹوں کو جن
سے ہر ایک بجائے خود سدّ سکندری ہوتی ہے۔ دور کرنے اور
توڑنے میں کوئی ہمت والا کامیاب بھی ہو جائے تو اسے پھر بھی
کسی خاص منفعت کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ بھی فروخت ہو جائیں
تو کون سی رقم ہاتھ آ سکتی ہے۔ اسے تو اتنی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ
کوئی بندہ خدا کا اسے اس محنت شاقہ کی داد ہی دے۔ ہاں عیب
چینوں اور بدگوؤں کی جماعت اور صلواتیں سنانے کے لیے ضرور صف آرا
ہو جاتی ہے۔ کوئی کہہ دیتا ہے۔ یہ محض فہرست ہے۔ کوئی کہتا ہے
کتابت اچھی نہیں۔ طباعت اچھی نہیں۔ پروف نہیں دیکھے۔ قیمت
زیادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

چہ می گوئیم اگر ایں است وضع روزگار
دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

ان حالات میں اگر کتابت و طباعت اور کاغذ کا ہی خرچ وصول
ہو جائے تو لبا غنیمت ہے۔ لیکن حالات زمانہ کیسے ہی دگرگوں کیوں
نہ ہوں جن شعرائے ماضی و حال کو اس تذکرہ کے ذریعہ حیات
جاوید حاصل ہوتی ہے ان کا نام ان کا کلام بلکہ ان کی روحیں مولف
تذکرہ کی اس نہایت بے غرضانہ کوشش پر آفرین کہیں گی۔ اور
اس کی حیات بخش مساعی کی داد دیں گی۔

اس تذکرے میں بہت سے بزرگ ایسے بھی ہیں جن کا نام

کبھی نہ سنا ہوگا۔ نام سنا ہوگا تو کلام نہ سنا ہوگا۔ امتداد زمانہ نے جہاں ان کو اٹھا دیا وہاں ان کے نام اور کلام کو بھی صفحۂ ہستی سے محو کر ڈالا۔ مقام شکر ہے کہ برق صاحب کی مسیحا نفسی سے وہ بزرگ بھی اب پھر زندہ ہو گئے ہیں۔ ان بزرگوں اور ان شعرائے ہنود کا جو اس وقت بہ فضلہ زندہ ہیں۔ چہرہ اور منتخب کلام مع ان کے ضروری حالات زندگی کے اس تذکرہ میں بڑی خوبی اور سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے۔ حالات زندگی بھی تا حد امکان صراحت سے لکھے گئے ہیں۔ خصوصیات کلام بھی تحقیق کامل کے بعد درج کیے گئے ہیں۔ تنقیدی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور تذکرہ کو محض فہرست نہیں بنایا گیا ان خوبیوں کی وجہ سے فاضل مؤلف کی محنت اور بھی مشکور نظر آتی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت خوب واضح اور روشن ہوتی ہے کہ اردو زبان کے ہندو شعراء کا سلسلہ شہزادہ دارا شکوہ کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک انہوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس پر فاضل مؤلف نے مؤرخانہ انداز میں ایک علیحدہ مقالہ سپرد قلم بطور تمہید کے کیا ہے جسے اس ضخیم تذکرہ کا نہایت ضروری خلاصہ کہنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کی آنکھوں پر غرور کا پردہ پڑا ہوا ہے اور جنہوں نے شعرائے ہنود کی خدمات اور کمال کو بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور جو اصحاب ہنود کو اردو زبان کا دشمن اور ان کی شاعرانہ قابلیت کو ناقابل شمار سمجھتے ہیں اور جن کی عصبیت کا یہ شعر صحیح طور پر ترجمان ہے۔

مانیں گے وہ کبھی نہ ہمارے کمال کو
تارے بھی توڑ لائیں اگر آسماں سے ہم

ان تمام تنگ دلوں کے سامنے یہ کتاب نہایت بلند آہنگی سے دندان شکن جواب پیش کر رہی ہے۔

مشتاقانِ سخن اور قدرشناسانِ ادبِ اُردو کی طرف سے اس تذکرہ کی کم سے کم داد یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اس کی خریداری سے مولّف، تذکرہ کی حوصلہ افزائی فرمائیں اور اس حقیقت کو عالم آشکارا کر دیں کہ بے غرضانہ اولوالعزمی کی قدر ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

حالاتِ زمانہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس تذکرہ کی صرف چار سو جلدیں چھپوائی گئی ہیں۔ کتاب طلب کرنے کے لیے جناب برقؔ صاحب ہی کی خدمت میں جن کا پورا پتہ اس تبصرے کے ابتدائی حصّے میں درج کیا گیا ہے۔ درخواست بھیجنی چاہیئے۔

* * *

بہاراں

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی بی۔ اے۔ ایم۔ بی ٹی ڈپٹی کمشنر سیتاپور کی غزلیات کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ "بہاراں" اسی مجموعہ کلام کا نام ہے۔ جس میں ظاہر کو دلکش بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ کتابت بھی بہت کشادہ اور جلی قلم سے ہے۔

جناب اثرؔ جناب عزیزؔ لکھنوی کے نامور تلامذہ میں سے ہیں۔ دنیوی شخصیت کے علاوہ حسن سخن کے لحاظ سے بھی ان کی شہرت کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مصنف نے نہ تو اپنے حالات زندگی اس مجموعہ کلام کے ساتھ شامل کیے اور نہ رواج کے مطابق کسی مشہور ادیب اور نقاد سخن کا تبصرہ شامل کرنا درخور اعتناء سمجھا۔

جناب اثرؔ کا یہ پہلا مجموعہ کلام اسم بامسمی سمجھنا چاہیے۔ اپنی نزہت و لطافت کے لحاظ سے بہت کچھ قابل ستائش ہے۔ ہر صفحہ پر دو چار، شعر ایسے نظر آتے ہیں جنہیں عمیق جذبات کے لحاظ سے دفتر معانی کہا جا سکتا ہے۔ معاملہ بندی اور محاکات

کی مثالیں اگرچہ کم نظر آتی ہیں۔ اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ شاعر کا رجحان طبعیت فلسفیانہ شاعری کی طرف زیادہ ہے لیکن یہ کسی تخیل اور معنی آفرینی کو صفائی بیان اور لطف زبان کو دوش بدوش رکھ کر پوری کر دی گئی ہے۔ فلسفیانہ شاعری میں بعض مضامین ایسے بھی آ جاتے ہیں کہ جو مصرعوں کی تنگ دامانی میں ان کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور سادہ و عام فہم الفاظ انہیں واضح کرنے میں معاون نہیں ہوتے۔ اس لیے شاعر مجبور ہوتا ہے کہ نئی نئی ترکیبوں کی طرف متوجہ ہو۔ مثلاً اثر صاحب کا ایک مصرع ملحوظ ہو۔

مانتا ہے دل دیدار تقاضا کوئی

یہاں دل دیدار تقاضا کی قابل داد ترکیب سے اگر فائدہ نہ اٹھایا تو یہ مضمون مصرع میں کسی طرح نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی کوشش ہر جگہ کامیاب مدعا نہیں ہوا کرتی اور یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ شاعری میں بعض مقامات لازمی طور سے ناہموار نظر آیا کرتے ہیں۔ اگرچہ پختہ مشقوں کا وجدان صحیح تا بہ مقدور ان مضامین کے اسلوب بیان کو واضح اور ہموار دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پھر بھی ماننا پڑتا ہے کہ مضمون کی وسعت ہر جگہ شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس نظریہ سے جناب اثر کا کلام بھی مستثنے نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو میدان اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ اس میں نشیب و فراز کا ہونا لازم ہے۔ غالب مرحوم کا

کلام بھی اسی نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ فلسفیانہ انداز سخن میں یہ قول کہ "شعر پڑھا اور دل میں اترا" ہر جگہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ با ایں ہمہ جناب اثرؔ کے مجموعہ کلام میں بیان کی ہمواری اور صراحت توقع سے بڑھ کر ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نگار خانۂ رضواں بھی ہو تو ویراں ہے	ترے خیال کا آئینہ جس مکاں میں نہیں
کرم قبول مگر لذتِ ستم کے لیے	خطا معاف مزاجِ ش جاوداں میں نہیں
پھر ایسی تلخ نوائی سے فائدہ اے دل	کشودِ کار کی ہمت اگر فغاں میں نہیں
یہ طعن سن کے تو اٹھے نگاہِ شرم آلود	کوئی بھی تیر اس اتری ہوئی کماں میں نہیں
مجھے بتا دے یہ سودائے جستجو کیا ہے	اگر وہ یوسفِ گم گشتہ کارواں میں نہیں

پانچوں شعر جناب اثرؔ کی مخصوص روش کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور بتا رہے ہیں کہ قابل مصنف کا موضوعِ سخن اور انداز شاعری کیا ہے۔ پہلے شعر کا مصرع ثانی استادانہ بندش کا ناقابل انکار ثبوت پیش کرتا ہے۔ دوسرے شعر کے الفاظ بھی اس قدر جچے تلے ہیں کہ ان میں کسی کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ مضمون ان دونوں مصرعوں میں بند کرنا آسان کام نہ تھا۔ تیسرے شعر میں تلخ نوائی اور کشود کار کی ترکیبیں اس قدر ضروری ہیں کہ ان کے بغیر یہ شعر کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا۔ چوتھے شعر میں مضمون کی تازگی اور اس کی جدت طرازی اور جدت ادا دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ آخری شعر میں ایک امر واقعی کا اظہار کیا گیا ہے۔ جستجو اسی چیز کی ہوتی ہے۔ جس کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ چیز ضرور وہاں موجود ہے۔ جہاں،

اس کی تلاش کی جاتی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو پھر وہ جستجو سودا کے مماثل بن کر رہ جاتی ہے۔ جو لوگ محبوب حقیقی کی جستجو میں شدید ترین ریاضت گوارا کرتے ہیں۔ یہی یقین انہیں یہ مصیبت مول لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سودا کو سودا کے مماثل سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت نفس الامری کو بھول جاتے ہیں کہ کسی چیز کی جستجو کامیابی کی اُمید کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

اگر ہے شوق کامل ترک اس کی جستجو کر دے
نیاز عاشقی کو بے نیاز آرزو کر دے

نہیں ممکن اگر دیدار اے دل یہ تو ممکن ہے
کہ روشن رہ گذر میں اک چراغ آرزو کر دے

کبھی تو غور کر غافل مآل زندگانی پر
کبھی تو محو دل سے یہ طلسم رنگ و بو کر دے

تینوں شعر استادانہ بندش اور کمال سخن کا آئینہ ہیں۔ پہلے شعر کا مصرعہ ثانی کس بلا کا ہے اس پر جو مصرعہ لگایا گیا ہے وہ بھی مطلع کی صورت میں اس سے زیادہ قوت بیانیہ کا اظہار شاید مشکل سے کیا جا سکے۔ دوسرا شعر طالب صادق کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ اس شعر کا مصرع ثانی نفس مضمون اور اس کی تائید کے لحاظ سے بہت ہی قابل داد ہے۔ تیسرے شعر میں تقابل بیان کے لطف کے علاوہ یہ انداز بیان بھی بے حد قابل ستائش ہے کہ اگرچہ مآل زندگانی نہیں بتایا گیا مگر ایک لفظ طلسم نے اس اخفا کی پوری صراحت کر دی ہے۔

بے نیازی تری خو ہے مری طینت کے نیاز
مجھ پر احسان نہ کرنا بھی ہے احسان کرنا

اف وہ بے دردِ اسیرانِ ستم پر جس کو
آزمائش کے لیے وا درِ زنداں کرنا

اخترِ افشاں رخِ زیبائے قمر ہو جائے
ہاں ذرا اور پشیماں کو پشیماں کرنا

پہلے شعر میں متضاد دعوے کس خوبی سے ثابت کیا ہے یہ مضمون آفرینی اور یہ صفائی بیان ہر پہلو سے قابل دید ہے۔ دوسرے شعر کا مضمون بالکل نیا ہے۔ اس بے دردی کا کیا ٹھکانہ جو در زندان کھول کر بطور آزمائش روا رکھی جائے۔ اور اسیران ستم کو اس طرح ترسا ترسا کر شدید قسم کی روحانی تکلیف دی جائے۔ اس شعر کی ردیف بھی بہ لحاظ زبان وجدانی کیفیت رکھتی ہے۔ تیسرے شعر میں عرق خجالت کا مضمون بطور کناب اتنا خوبصورت ہے کہ شیطان ہونے والے حسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔

دوبارہ پائے بت پر سجدۂ مستانہ کرنا ہے
فراہم کر رہا ہوں منتشر اجزائے ایماں کو

یہ شعر مرزا غالب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ پہلے سجدے کا جو انجام ہوا اسے بھی اخفا کے پردے میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ لفظ دوبارہ سے فراوانی شوق اور لفظ مستانہ سے طغیانی ذوق کا منظر پہلے سجدے کا انجام دیکھ چکنے کے باوجود اتنا دلچسپ اور قابل دید ہے کہ زور کلام کا اعجاز ہی اس قسم کے مناظر

دکھا سکتا ہے۔

دِل لرزتا ہے مگر پھر بھی ادھر کھنچتا ہے
کوئی ایسا بھی نہ محکومِ نظر ہو جائے

وائے بر دل جسے ہو صورت و معنی میں تمیز
حیف وہ ذوق جو پابندِ نظر ہو جائے

پہلے شعر میں ایک عام مضمون کو معنی آفرینی اور نزاکت بیان سے جتنا بلند کیا جائے وہ اثر صاحب کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہے۔ دل لرزتا ہے اس ٹکڑے میں جو وسیع مضمون پنہاں ہے اس کا کہیں مذکور نہیں بلکہ اشارہ تک نہیں لیکن باوجود اس کے وہ خوفناک منظر مکمل طور سے سامع کی آنکھوں کے سامنے آگیا ہے دوسرے مصرعے نے یہ مضمون سخن گسترانہ انداز میں اتنا بلند کر دیا ہے کہ ذوق طبیعت بے اختیار ہو کر داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ محکوم نظر ان دو لفظوں کے مفہوم میں جو وسعت ہے اس کی داد کہاں تک دی جا سکتی ہے۔ دوسرا شعر تقابل بیان کے ظاہری حسن سے مالامال ہونے کے علاوہ معنوی لحاظ سے بھی بیت الغزل ہے۔

دل سے خیال بادہ و ساغر نہ مٹ سکا
ہم توبہ کر کے اور گنہگار ہو گئے

اس سے زیادہ حسن سخن اور بے تکلفانہ انداز بیان اور کیا ہوگا۔ شعر اگرچہ رندانہ اور اثر صاحب کی عام روش سے مختلف قسم کا ہے۔ مگر معنی آفرینی کا کیف و سرور اس میں بھی اس قدر فراوان ہے کہ شعر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر بھی طبیعت

میسر نہیں ہوتی۔

بہت ناز ہے تجھ کو اے دل وفا پر — کسی دن کیے کی سزا پا رہے گا
خدا کیلئے اے دلِ داغ ساماں — کہاں تک ہلاکِ تمنا رہے گا
زمانے کو ایک رنگ پر کس نے دیکھا — بدلتا رہا ہے بدلتا رہے گا
حیا شیوۂ حسن ادب شرطِ الفت — ملے بھی تو آپس میں پردہ رہے گا

اثرؔ دل کو بیکار سمجھا رہے ہو
تڑپتا رہا ہے تڑپتا رہے گا

چونکہ یہ زمین فلسفیانہ شاعری اور معنی آفرینی و نزاکتِ خیال کی متحمل نہیں اس لیے اثرؔ صاحب نے اس میں وہی روش اختیار کی ہے۔ جو اس زمین کو پُر بہار بنانے کے لیے مخصوص ہے۔ اور جس میں سادگی بیان کے سوا چارہ نہیں۔ پانچوں شعروں کی سادگی اور اس کے ساتھ لطافتِ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ جناب اثرؔ ہر قسم کی غزل کہنے پر قادر ہیں۔ اگرچہ دوسرے اور چوتھے شعر میں وہ معنی آفرینی اور جدتِ ترکیب کی طرف جُھک گئے ہیں۔ مگر پھر بھی تغزل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اس قسم کا کلام بھی اس مجموعہ میں کافی ہے۔ اور انتخاب کے طور پر صدہا اشعار اِسی رنگ میں پیش کیے جا سکتے ہیں مگر مصنف کی صحیح روش اور میلانِ سخن وہی ہے جو اس سے پہلے گذارش کیا گیا۔

اگرچہ وہ شوخیٔ طبع اس مجموعہ میں نظر نہیں آتی جو غالبؔ داغؔ اور ریاضؔ خیرآبادی کے کلام سے مخصوص ہے۔ مگر خیالات کی پاکیزگی و نفاست مضامین کی خوبی و بلند آہنگی جدتِ خیال اور تازگی بیان

اور اسی قسم کے متعدد محاسن اس کمی کو بدرجہ اتم پورا کر رہے ہیں۔ حق یہ
کہ بزمِ معانی میں متانتِ مضمون ہی مسند نشین ہوا کرتی ہے اور سوز
وگداز کی دُنیا میں زندہ دلی و شوخیٔ طبع کی کوئی قیمت نہیں ہوتی
اس نظریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ جناب اثرؔ کا یہ مجموعہ
کلام متانتِ مضامین کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر چیز ہے۔ شوخ بیانی
اگر اس میں نہیں ہے تو یہ چیز ان کے موضوعِ سخن سے بالکل
مختلف ہے اور بے تعلق بھی۔

الغرض "بہاراں" اپنے ظاہری و معنوی محاسن کے لحاظ سے
اُردو ادب کے ذخیرہ تصانیف میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس میں
عریانیٔ مضمون کا شائبہ تک نہیں ہے۔ جو دبستانِ لکھنؤ شعرائے
لکھنؤ سے منسوب کرتے رہتے ہیں۔ امید ہے کہ عمدہ اور پختہ و
پاکیزہ کلام جستجو کرنے والے جناب اثرؔ کی اس کوشش کو جو
اس مجموعہ کلام کی اشاعت سے وابستہ ہے۔ اپنی قدر شناسی سے
مشکور خیال کریں گے۔

کلامِ ربّانی

پنڈت یوگ راج صاحب نظرؔ سوپانوی کی تحسین طلب ہمت و اولوالعزمی سے گیتا کا مشہور عالم فلسفہ منظوم اُردو ترجمے کی صورت میں "کلام ربانی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جسے ایک مفید کوشش کہنا چاہیے ضخامت بڑی تقطیع میں دو سو صفحے کی ہے۔ قیمت صرف بارہ آنے ہے۔

مصنف کی اس محنت شاقہ کے معاوضے میں پانچ ہزار روپے مختلف ہندو امراء و رؤسا کی طرف سے بطور انعام مل چکے ہیں۔ جو اُردو نظم کی کس مپرسی ہیچ میرزی کے دور میں بسا غنیمت سمجھنا چاہیے۔

فلسفہ اور بالخصوص روحانی فلسفہ کے نہایت پیچیدہ مسائل سلیس اور ہموار نظم میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ سب سے مشکل تو سنسکرت الفاظ کی بہتات ہے جس کے صحیح تلفظ کو ہر جگہ ایک ہی شکل میں ادا کرنا اس سے بھی زیادہ ناقابل عمل ہے۔ دوسری بڑی مشکل ان دقیق ترین مضامین کو واضح طور سے سمجھنا اور پھر ادائے مطلب کے لیے

مخصوص الفاظ اور مخصوص اصطلاحات کی تلاش کرنا ہے۔ زبان کے افلاس کی وجہ سے یہ مشکل اس قدر موجب اشکال ہے کہ ہر متکلم کا ناطقہ بند اور ہر ایک ناظم کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ پابندی کہ یہ مشہور عالم فلسفہ بیان کرنے والے کی شان میں کوئی ایسا لفظ استعمال میں نہ آئے جسے سوئے ادب پر محمول کیا جا سکے۔ روحانیت کے وجدانی مضامین کو ہموار نثر ہی میں بیان کرنا دشوار ہے۔ چہ جائیکہ اسے ہموار نظم میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ غرض بہت سی مشکلات اور بہت سے موانع ہیں۔ کوئی ستم ورتت ہی اس ہفت خوان کو طے کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ جناب نظمؔ سوہانوی کا یہ منظوم ترجمہ ان منظوم تراجم سے جو اب تک منظر عام پر لائے گئے ہیں زیادہ صاف زیادہ سلیس زیادہ ہموار اور زیادہ کامیاب ہے۔ چند اشعار جو ایک ہی جگہ سے بے فصل درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

ہیں ہی اس عالم کی ہوں جائے پناہ	سب کا رازق اور سب کا خیر خواہ
دیکھنے والا ہوں نیک و بد کا میں	پاسباں ہوں عالمِ بے حد کا میں
ہے مجھی سے سب کے رہنے کا مقام	میرے ہی دم سے ہے عالم کا نظام
بے غرض مہر و کرم کرتا ہوں میں	لطف سب پر دم بدم کرتا ہوں میں
اس جہاں کا اول و آخر ہوں میں	لے فنا ہوں مخفی و ظاہر ہوں میں
میں ہی اس عالم کا ہوں وجہِ وجود	باعث ہنگامہ بود و نمود
ابر کھلتا ہے مرے احکام سے	اور برستا ہے مرے انعام سے

روح بھی اور مادہ بھی مجھ سے ہے　　یہ بقا بھی یہ فنا بھی مجھ سے ہے

ایک اور مقام کے چند اشعار سلسلہ وار ملاحظہ فرمائیں۔

اس جہاں کے دل میں جو موجود ہے　　جو تمہارا منزلِ مقصود ہے
غیر فانی ہے وہ ہے بے مثل ذات　　ہے اسی کے دم سے دنیا کو ثبات
جو کبھی گھٹتا نہیں بڑھتا نہیں　　موت کے ہتھے کبھی چڑھتا نہیں
روح ہے نام اس وجودِ پاک کا　　جبر کے بس میں ہے یہ قالب خاک کا
اس بے فانی کا تو ماتم نہ کر　　جنگ کو ان خاکیوں کا غم نہ کر

اس اقتباس سے اہلِ نظر اندازہ فرما سکتے ہیں کہ قابل مصنف نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے خوش بیانی کا حق ادا کرنے میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔ متفرق مقامات سے دو تین شعر اس قسم کی خوش گوئی کے ثبوت میں درکار ہوں تو ہر ایک صفحہ پر ایسی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اس طویل انتخاب کی گنجائش نہیں۔ یہی دو نمونے جو اوپر لکھے گئے ہیں اس بات کا وزن کہنے کے لیے کہ مصنف کا انداز سخن کیا ہے کافی معلوم ہوتے ہیں۔

باوجود اس نمایاں کامیابی کے جو قابل مصنف نے اپنے حسن طبیعت اور قوت بیانیہ سے حاصل کی ہے۔ اظہار حق گوئی یہ کہنے میں متامل ہے کہ اب اس مشہور عالم فلسفہ کو اردو نظم کا جامہ پہنانے میں مزید راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نکات فن کے ماہر اس منظوم ترجمہ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں گے تو بعض نظر آئیں گے جن پر مزید توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے مثلاً قافیہ کے سقم بعض جگہ موجود ہیں۔ جن کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

سوکھا اور ٹوٹنا فتح اور سطح واو معروف اور واو مجہول کو بالمقابل حرف روی قرار دینا کرو اور لرٹو بچانے اور مٹانے دانندہ اور تابندہ مخلوقات اور موجودات جلووں اور شکلوں کرو اور بنو وغیرہ۔ فارسیت اگرچہ ایک وسیع مضمون کو چھوٹی سی بحر کے دو مصرعوں میں بیان کرنے کے لیے اکثر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مگر بعض جگہ وہ سنجیدہ صورت میں پائی جاتی ہے مثلاً دُرِ سلک گوہر دہر اندروں درغیب وظہور پس از مردن درسام وید بر عفو قصور در حرف ہیجا صدق دلی سے سر جھکاؤ پیش من برائے سوختن وغیرہ۔

متروکات زبان کو اگرچہ بہت حد تک زیر نظر رکھا گیا ہے مگر اس پہلو میں مزید احتیاط و احتراز کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ مثلاً آنکھوں میں جا پاؤ گے تم۔ جوں برگ کنول تمہ مہر و ماہ و عرش و فرش و بکر و بر (قوانی عطف) لیک وغیرہ۔

بعض جگہ ترکیبیں معیوب اور محلِ نظر ہیں۔ مثلاً حواس و سانس جگر و گداز برگ و پیدائش برگ، کنول منزلِ رسا اہل مکہ و پھند خوش ترنم ساز وغیرہ۔

شکست ناروا کا سقم بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک طویل اور مسلسل بیان میں جو کسی فرد واحد کی طرف سے بطور تقریر ہو کئی مقامات ایسے آ جاتے ہیں کہ پوری بات ایک شعر میں اور وہ بھی چھوٹی سی بحر کے دو مصرعوں میں بیان کرنی مشکل ہو جاتی ہے مگر پھر بھی مصنف کا فرض ہے کہ وہ ذیل کی سنجیدہ صورتوں سے بچے۔

۱۔ اس کو جو انسان استعمال میں — لائے پائے راحتیں ہر حال میں

۲۔ ناک کے نتھنوں سے چلتی سانس کی
آنے والی جانے والی سانس کی
حالتیں بالکل برابر کرتے ہیں
دم کی یکساں چال کا دم بھرتے ہیں

۳۔ عیش جو ہیں دیوتاؤں کے لیے : شاد کام ان سے وہ ہوتے ہیں ولے
ختم ہو جاتے ہیں نیک اعمال جب — چھوڑ کر فردوس کی بزمِ طرب
واپس آتے ہیں اسی دنیا میں پھر — جنم پاتے ہیں اسی دنیا میں پھر

آخیر میں ہم جناب نظر کو اس تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی راست روی اور مذاق سلیم سے جس کا ثبوت اس مجموعہ کلام میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کلام ربانی کے دوسرے اڈیشن میں ان معروضات کو جو مخلصانہ مشورہ کی حیثیت میں ہیں ضرور ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ اور اس متاع ادب کو جو سب کے نزدیک قابل قدر ہے بعد نظر ثانی اردو زبان کے لیے سرمایہ فخر و مباہات بنا دیں گے مسلمان حضرات اور نادار ہندو طلبہ کو مناسب تصدیق پر صرف ساڑھے تین آنے محصول ڈاک بھیج کر ہی یہ کتاب مل سکتی ہے۔

٭ ٭ ٭

آیاتِ وجدانی

مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی۔

اس مشہور اور مستغنی عن التوصیف کتاب کا جدید ایڈیشن بہت مفید اضافے کے ساتھ مرزا صاحب نے ۱۹۴۵ء میں شائع فرمایا ہے۔ کتاب مجلد ہے ضخامت ۴۰۰ صفحات کی اور قیمت پانچ روپے ہے۔ کتابت و طباعت قابل ستائش اور دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی اس نایابی کے زمانے میں کتاب کے حسن ظاہر کی شان کے مطابق لگایا گیا ہے۔ معنوی خوبیوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ نہایت بلند پایہ کلام اور اس کے ساتھ تنقید نگاروں کی تنقیدیں۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں ادبی اور فنی نکات واضح نہ کیے گئے ہوں۔ آخر میں مرزا صاحب کے قلم سے دو تین زبردست تنقیدی مضامین بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ جدید شاعری کے نقائص اور اس کی ادبی خامیوں پر بھی زوردار تنقید کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مرزا موصوف کے خیالات فی الواقع سننے کے قابل ہیں۔

مختصر یہ کہ "آیاتِ وجدانی" ذوق سخن رکھنے والوں کے

لیے بیش بہا ادبی خزانہ ہے۔ غالب اسکول جس قسم کی فلسفیانہ شاعری کو پسند کرتا ہے ان کے لیے بھی اور نکات فن سمجھنے والوں کے لیے بھی یہ ایک نادر چیز ہے۔ تمام ادب پرور اصحاب کے لیے اس قابل قدر تصنیف کی سرپرستی بہترین قسم کی خدمت ادب ہے۔

حرفِ ناتمام

منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی مرحوم کی مشہور تصنیف "مطلع انوار" تو ان کی زندگی ہی میں اشاعت پذیر ہو کر دنیائے ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ دوسرا مجموعہ "کلامِ برقؔ" مرحوم کے عقیدت مند شاگرد ستیش چندر سکسینہ طالبؔ بی اے دہلوی نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات اور قیمت دو روپے۔

برقؔ صاحب کو اپنی ناگہانی اور بے وقت موت کی وجہ سے پہلے یہ موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ وہ اپنے منتشر کلام کو ایک جگہ جمع کر سکتے۔ اس مجموعہ کو جو ابھی مکمل نہیں کہا جا سکتا چھ سال کے بعد شائع کرنے کے قابل ہونا ان مشکلات کا تصور دلاتا ہے۔ جو اس منتشر کلام کو جمع کرنے کی دوڑ دھوپ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طالبؔ صاحب نے "حرفِ ناتمام" کی اشاعت سے اپنی عقیدت مندی اور اخلاص وارادات کا حق ادا کر دیا ہے۔

پہلے حصّے میں ۸۴ صفحے تک مختلف عنوانوں کے ماتحت نہایت فصیح و بلیغ نظمیں ہیں۔ یہ عنوان بالکل نئے ہیں مثلاً مہارانا پرتاپ اور باوفا چٹک تلاداں وغیرہ۔ بعض نظمیں ہنگامی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً زلزلے کی تباہ کاریاں۔ گرمی کی شدت بعض عنوان مناظر سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً نسبت کہکشاں نورانی کلیاں یا ستارے۔ الغرض اس حصہ میں تنوع کا عالم پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ہر نظم کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نظم کہاں سے دستیاب ہوئی اور کب شائع ہوئی تھی۔

دوسرے حصے میں جس کا نام "باغ و بہار" ہے۔ غزلیات ہیں۔ کوئی غزل سالم ہے کسی کے دو شعر ہیں۔ کسی کے چار یعنی اپنی یا کسی اور صاحب ذوق کی یادداشت سے جو کچھ ملا ہے اسے طالب صاحب نے دامن نیاز میں جگہ دی ہے۔ لطف زبان اور حسن بیان کے لحاظ سے یہ حصّہ بھی قابل قدر ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

رہے گا کس کا حصّہ بیش تر میرے مٹانے میں
یہ باہم فیصلہ پہلے زمیں و آسماں کرلیں

⁂

محبت میں ہتھیلی پر جو رکھ کر سر نکلتے ہیں
وہی جاں باز راہِ عشق میں کچھ کر نکلتے ہیں

چلو پھر بزمِ میخانہ چلیں پھر توڑ لیں توبہ
ابھی تو اپنے ہی کچھ دام ساقی پر نکلتے ہیں

آئے ہیں وہ کھینچ کر مقتل میں تیغِ آب دار
سر سے اونچا اب نظر آنے لگا پانی مجھے

(ب)

نگاہوں ہی نگاہوں میں ہوا عہدِ وفا باہم
ہوا طے ہر مرحلہ دل کا اشاروں ہی اشاروں میں

(ج)

اہلِ ذوق اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار کس پائے کے ہیں اور ان کا مصنف میدان غزل کا کیا شہ سوار ہے۔ چونکہ اس مجموعہ کلام کا بہت سا حصہ زبانی یادداشت سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ بعض اشعار میں کسی کے حافظہ نے بے وفائی کی ہو۔ صفحہ ۳۸ پر ایک مصرعہ اسی قسم کی فروگذاشتوں کی ایک مثال ہے۔

دم بخود آشیاں برباد رہا کرتے ہیں

لفظ آشیاں کی تخفیف کا الزام برق صاحب پر عائد کرنا فاضل مصنف سے شدید ناانصافی ہو گی۔ قیاس غالب یہی ہے کہ برق صاحب نے یہ مصرع اس صورت میں ہرگز نہ کہا ہو گا۔ اسی قسم کی بعض مثالیں اور بھی ہیں۔ مگر ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔

تیسرا حصہ بزم ماتم کے نام سے صفحہ ۱۳۱ سے شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں وہ قطعات تاریخ ہیں۔ اور ماتمی نظمیں بھی۔ جو مختلف شعرا نے برق صاحب کی بے وقت موت پر لکھیں۔

چوتھے اور آخری حصہ کا نام بابِ نو ہے اس حصے میں بھی مختلف عنوانوں پر نظمیں ہیں۔ مثلاً جماجی کا سیلاب

جشن چراغاں۔ مہاتما گاندھی۔ بسنت رُت۔ تنوع کا عالم اس حصہ میں بھی وہی ہے جو پہلے حصہ میں تھا۔ خوش بیانی کے لحاظ سے یہ نظمیں بھی کامیاب ہیں۔

مختصر یہ کہ "حرفِ ناتمام" حسن ظاہر و حسن باطن کے اوصاف کی وجہ سے بہت قابل قدر ہے۔ مصنف کا نام نامی اس مجموعہ کلام کے جاذب نظر اور جاذب توجہ ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ اُمید ہے کہ اربابِ ذوق "حرفِ ناتمام" کی قدرشناسی کی صورت میں طالبؔ صاحب کی محنت شاقہ کی داد دیں گے۔

ﷺ ﷺ ﷺ

مطلع انوار

اس کتاب میں ان تمام نظموں کو جمع کر دیا گیا ہے جو منشی مہاراج بہادر برق دہلوی نے اب تک کہی ہیں اور "مطلع انوار" کے نام سے سپرد اشاعت کر دی ہیں۔ یہ دل افروز مجموعہ مختلف قسم کے عنوانوں پر مشتمل ہے۔ ان عنوانوں کی تعداد ۹۰ ہے۔ عنوانوں کی فہرست ہی برق صاحب کی پاکیزہ کلامی کی زبردست شہادت ہے۔ کوئی عنوان ایسا نہیں جس کو ذوق سلیم بار خاطر خیال کرے۔ بعض عنوان ایسے بھی ہیں جن پر قلم اٹھانے کے لیے تخیل کی زبردست قوت درکار ہے۔ مثلاً بچے کی گلابی مسکراہٹ قوس قزح برسات اور منظر کوہ عروس مرگ وغیرہ۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ برق صاحب مشکل سے مشکل عنوان پر خوش بیانی کا جوہر دکھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے ہر عنوان پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور کہیں بھی پستی مذاق کا الزام ان پر عاید نہیں ہوتا۔ نیز انہوں نے شاعرانہ حسن بیان کا سلسلہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مثلاً مٹی کے چراغ پر ایک مسدس لکھا ہے۔ نظم اردو کی تاریخ میں یہ عنوان بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔ اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں۔

شام غم اس کے فروغ رخ سے نورانی ہوئی
تیرگی میں نور پھیلا جلوہ سامانی ہوئی

طفلک نوخیز کی اس سے نظر مانوس ہے   اس کا جلوہ بے نیاز پردۂ فانوس ہے
جھونپڑی مفلس کی روشن ہے اسی کے نور سے   یہ مسافر کو دکھا دیتا ہے منزل دور سے

برق شائد مہرۂ مار سیاہ شب ہے یہ
یا زمیں پر چرخ سے ٹوٹا ہوا کوکب ہے یہ

شام اور وہ بھی شام غم کا نورانی ہو جانا معمولی بات نہیں۔ حد سے زیادہ مدح کی گئی ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ حقیقت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شام غم کس حد تک نورانی ہوتی ہے اس کی تشریح مصرع دوم میں صرف دو لفظوں سے کی گئی ہے۔ یعنی جلوہ سامانی ہوئی۔ ان دو لفظوں سے لفظ نورانی کی جو تشریح ہوتی ہے۔ اس سے فاضل مصنف کی روشن بیانی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایسا لفظ حسنِ اتفاقاً سے سوجھا کرتا ہے۔ جس میں معنی کی وسعت احاطہ بیان سے بہت زیادہ ہو۔ دوسرے شعر میں دو نوں باتیں حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں کر رہی ہیں۔ اس معنوی خوبی کے علاوہ شعر کا حسن ظاہری زبان کی صفائی فارسی ترکیبوں کی مناسبت اور چستی بندش کے لحاظ سے بہت قابلِ تعریف ہے۔ تیسرے شعر کا مضمون اگرچہ بظاہر معمولی سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ معمولی سی مدح ممدوح کی شان کو سب سے زیادہ نمایاں کرنے والی ہے۔ مسافر کو دور سے منزل کا دکھائی دینا اور وہ بھی رات کی تاریکی میں اس کی خاص مسرت کا موجب ہے اور یہ خاص مسرت اس کو چراغ کے سوا کسی اور کے ذریعے سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ مفلس کی جھونپڑی ان لفظوں سے جو درد ناک منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے اس سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ مقام بھی جس کے ظاہر و باطن پر خوفناک تاریکی

ہر وقت چھائی رہتی ہے - اس کے نور سے روشن ہوتا ہے - لفظ "اسی" سے ظاہر ہے کہ دنیا بھر میں اس تاریک مقام کو روشن کر دینے کی پرواہ کسی کو نہیں ہے تو اسی مٹی کے چراغ کو۔

چوتھے شعر میں دو تشبیہیں مذکور ہوئی ہیں اور دونوں یادگار ہیں۔

برقؔ صاحب کے کلام کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے کہ ان کے ہاں تشبیہات کا خزانہ بہت نادر اور نہایت قیمتی ہے - اس قسم کی تشبیہات اور وہ بھی اس کثرت کے ساتھ یا تو حضرت اثیمیؔ کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور یا چشم بد دور حضرت برقؔ کے کلام میں - یہاں ایک مثال اور بھی قابلِ ذکر ہے - کرمک شب تاب پر ایک نظم لکھی ہے - دو شعر اس کے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

محو پرواز یہ لعل یمنی ہے شاید اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید
جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں تو ہے وہ شمع کہ شرمندۂ فانوس نہیں

تشبیہات کے سلسلے میں پہلا شعر ہمارے دعوے کا بیّن ثبوت ہے جس طبیعت ہو تو ایسا ہی ہو - یہ دونوں تشبیہیں کچھ ایسی خوبصورت ہیں کہ حدِ توصیف سے باہر ہیں - لفظ شاید نے ان کی ندرت کا عیب بھی حسن میں تبدیل کر دیا ہے - مصرعِ اوّل میں لفظ محو اور مصرعِ ثانی میں اڑتی پھرتی کی داد کہاں تک دی جائے - پڑھنے والا پڑھتا ہے اور متحیّر ہو کر رہ جاتا ہے - دوسرے شعر میں مضمون یہ تھا کہ کرمک شب تاب ایک ایسی شمع ہے جو محتاجِ فانوس نہیں - محتاجِ فانوس کی جگہ یہ کہنا کہ شرمندۂ فانوس نہیں - شاعرانہ حسنِ بیان کا منتہائے کمال ہے -

ہیجوم یاس کے عنوان پر ایک مسدس لکھا ہے - اس میں بھی یہ جدت

ہے کہ یاس کو گالیاں نہیں دی گئیں بلکہ تسلیم و رضا کا پہلو نمایاں کیا گیا ہے اور دل کی پر سکون حالت کو جو یاس کے عالم میں پیدا ہوتی ہے۔ وجہ امتنان قرار دیا ہے۔ اس مسدس کے دو بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ دل مبتلائے شعبدہ ناز اب نہیں ارمانِ دل فریبیٔ انداز اب نہیں
دامن کشاں کرشمۂ آواز اب نہیں رازِ نیازِ چشمِ فسوں ساز اب نہیں

اچھا کیا جو تو نے کیا خون آرزو
دل تھا فریب خوردہ افسونِ آرزو

۲۔ احسان کون اٹھائے کسی مہ جمال کا اب سو چکا ہے چاک ہے دامن سوال کا
کیا انتظار آمد شام وصال کا ہنگامہ منتشر ہوا بزم خیال کا

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو
دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

پہلے بند کے چار مصرعوں میں برقؔ صاحب کی کامل مشق سخن پر دلالت کرتے ہیں۔ کوئی لفظ بیکار نہیں۔ مسدس میں دو تین باتیں خاص طور سے قابلِ لحاظ ہوتی ہیں۔ ایک تو بند کے چاروں مصرعے برابر کی شان رکھتے ہوں اور سلسلہ مضمون کے لحاظ سے دست و گریباں ہوں۔ ورنہ دو لخت ہو کر بے لطفی پیدا کریں گے۔ دوسرے یہ کہ ٹیپ کا شعر بہ لحاظ مضمون بند کے مضمون سے کافی ربط پیدا کرے۔ یہاں پر دونوں خوبیاں کامل طور پر نمایاں ہیں۔ دوسرے بند کا دوسرا مصرع کس قدر خوبصورت ہے۔ اور چوتھے مصرعے میں کلام کا خلاصہ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر الفاظ باوجود تلاش کے نہیں ملیں گے۔

روشنی علم کے عنوان پر ایک مسدس رقم فرمایا ہے۔ اس کا پہلا بند روانی کلام کے لحاظ سے کتنا دلکش اور بے ساختہ ہے۔

میہماں دن بھر ہے خورشیدِ سحر کی روشنی ۔ شام سے تا صبح ہے نورِ قمر کی روشنی
چار دن ہے جلوۂ حسنِ بشر کی روشنی ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے دنیا میں زر کی روشنی

ہے مگر اول سے آخر تک بشر کی روشنی
روشنیِ علم ہے آٹھوں پہر کی روشنی

ربطِ کلام کے ساتھ ساتھ مصرعوں کی برجستگی اور روانی دیکھئے۔ اس پر حقیقت نگاری کا حسن کیا بہار دکھا رہا ہے۔ ہر ایک مصرع نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور رنگ بالکل قدرتی ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کا نشان تک موجود نہیں۔ خورشید سحر میں اگرچہ سحر کا لفظ زائد تھا۔ مگر مصرع کے مضمون نے اس زائد کو بھی ضروری ثابت کر دیا ہے۔ چوتھے مصرعے میں جو تشبیہہ دی گئی ہے اس کی داد کہاں تک دی جائے۔ روشنی کو چھاؤں ثابت کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بند بھی بہت دلپسند ہے۔

اس کے پرتو سے سیاہی جہاں کی کافور ہے ہے یہی وہ نور سایہ جس سے کوسوں دور ہے
دیکھ لی جس نے جھلک اس کی وہی مسرور ہے کورِ مادر زاد کی آنکھوں میں اس سے نور ہے

مشتِ خاکِ انسان کا بھی بول بالا اس سے ہے
خاک دانِ دہر میں ہر سو اجالا اس سے ہے

اس قسم کے پامال عنوانوں پر نظم لکھنے میں اچھے اچھے چابک دست چابک بیان سست بیانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر اس بند کو دیکھئے کوئی مصرعہ حسن سے خالی نہیں۔ چوتھا مصرعہ سارے بند کی جان ہے۔ اس سے زیادہ تعریف روشنیٔ علم کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اندھے اور

وہ بھی مادر زاد اندھے کی آنکھوں میں نور پیدا کر دے۔ اس مضمون پر ہر شخص مصنف کے ذہن رسا کی تعریف کرے گا۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ رسالہ ادبی دنیا میں مصنف کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور دبی زبان میں تھوڑی سی جو مدح کی گئی ہے وہ بھی مدح مشابہ بالذم ہے۔ اس تنگ دلی پر غالب مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی ہے　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قدرتی مناظر کو بیان کرتے ہیں تبھی پریمی صاحب کا اشہب قلم برق رفتار نظر آتا ہے۔ برسات اور مناظر کوہ کے عنوان پر جو مسدس لکھا ہے اس کا ایک بند یہ ہے۔

وہ ہلکی ہلکی دھوپ وہ بادل کہیں کہیں　　قطعات کوہسار مسلسل کہیں کہیں
گھاٹی میں وہ بکھرے ہوئے جل تھل کہیں کہیں　　سبزے کے فرش غیرت مخمل کہیں کہیں
پھیلا ہوا وہ سلسلہ کوہ دور تک
اور اس پہ بادلوں کا وہ انبوہ دور تک

کتنا خوبصورت بند ہے سبحان اللہ۔ منظر کی تصویر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔ مضمون کی شگفتگی بیان کا اندازہ کرنا ہو تو یہی بند کافی ہے۔ ہر مصرع میں ردیف کو جس ہنرمندی سے سنبھالا ہے اس کی داد نہ دینا سخت ناانصافی ہے۔ اس نظم میں یہ دو شعر بھی بہت قابل داد ہیں ؎

سایہ کبھی ہے دھوپ کبھی ابر تر کبھی
دھندلا سا اک غبار ہے پیش نظر کبھی

وہ جنبشِ صبا سے مہکنا گیاہ کا
وہ کامیاب ہو کے پلٹنا نگاہ کا

پہلے شعر میں کوہستانی منظر کی مختلف صورتیں دلکش طریقے سے بیان کرتے ہوئے کیا تنوع کا عالم دکھایا ہے۔ الفاظ کی مناسبت بھی خاص چیز ہے۔ جو اس شعر میں اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ کوئی لفظ ثقیل نہیں۔ مدعیانِ سخن کے حال پر افسوس آتا ہے۔ کہ کس تندہی سے تہ مانوں کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ خود اسی عنوان پر قلم اٹھاتے ہیں۔ تو مناظرِ کوہ کو اے پہاڑ سے مخاطب کرتے ہیں۔ ثقالت کلام کا یہ حال اور اس پر لطافت نگاری کا دعویٰ۔

دوسرے شعر میں مصرعِ ثانی کو دیکھئے۔ نگاہ نے کیا کچھ دیکھا۔ اس مضمون کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ کامیاب ہو کر پلٹی ہے حسنِ بیان کا پورا حق ادا کر دیتا ہے۔

فسانۂ بہار کے عنوان پر غزل میں چند شعر کہے ہیں اور خوب کہے ہیں ملاحظہ ہوں۔

گل چیں نے پھول توڑ کے دامن میں رکھ لیے
لوٹا ہے سنگ دل نے خزانہ بہار کا

غافل یہ رنگ دیکھتی آنکھوں سے دیکھ لے
یاد آئے گا خزاں میں زمانہ بہار کا

گل نار ہی ہے غنچہ و گل پر گہر فشاں
شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا

پھوٹی ہے عکسِ سبزہ و گل سے شفق نئی
ہر آب جو ہے آئینہ خانہ بہار کا
آمادۂ وداع ہے دورِ شباب برق
گلشن سے قافلہ ہے روانہ بہار کا

ہر شعر بالکل صاف اور بے ساختہ کہا ہے۔ دوسرے شعر میں دکھتی آنکھوں سے دیکھ لے۔ یہ اسلوبِ بیان کتنا دلکش ہے۔ ہر شخص کو ایسے الفاظ نہیں سوجھتے۔
چوتھا شعر شاہدِ معنی کے لیے بجائے خود آئینہ خانہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شفق بالکل نئی ہے۔ آخری شعر کا مصرعِ ثانی بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔
اچھوتوں سے نفرت منقول ہے۔ اس موضوع پر بھی کئی شعر کہے ہیں۔ دو شعر نمونے کے لیے کافی ہیں۔

فطرت کا سب پہ حاوی قانون ایک ہی ہے
عنوان گو جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

پہلا شعر نفسِ مضمون پر کس قدر حاوی ہے۔ اس موضوع پر اگر پرتاب صاحب یہی ایک شعر کہہ دیتے تو کافی تھا۔ مصرعِ ثانی اس قدر مکمل اور جامع ہے کہ اس سے بہتر مصرع خیال میں نہیں آ سکتا۔ دوسرا شعر اگر جدّتِ ادا سے خالی ہے۔ لیکن پھر بھی ضرب المثل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

نیرنگِ ہستی کے عنوان پر چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہوتی ہے کہیں خوشی کی کہیں غم کی رات ہوتی ہے
ہر ایک بات یہاں بے ثبات ہوتی ہے کسی کے پھول کسی کی برات ہوتی ہے

کسی کو دستِ اجل سے اماں نہیں ملتی
حیات ملتی ہے پر جاوداں نہیں ملتی

بشر کو چاہیئے انجام پر نظر رکھے اسی میں خیر ہے دل میں نہ فکرِ شر رکھے
جہاں منزلِ عبرت ہے چشم تر رکھے یہاں ہر ایک قدم پھونک پھونک کر رکھے

تماشا گاہِ زمانہ کی سیر بھی کرے
جو ہو سکے تو کوئی کارِ خیر بھی کرے

یہ دونوں بند اپنے سادہ رنگ میں لاجواب ہیں۔ کوئی مصرع بے لطف و سقیم نہیں ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا مصرع کہہ دیا ہے۔ کسی کے پھول کسی کی برات ہوتی ہے۔ دوسرے بند کے مصرعہ ثانی میں لفظ خیر اور شر کا لطف ملاحظہ ہو۔ یہ آورد نہیں ہے۔ الفاظ کے لحاظ سے آورد کا رنگ برق صاحب کے تمام مجموعہ کلام میں نہیں ملتا۔ وہ صنائع لفظی کے خبط میں کہیں مبتلا نہیں ہوتے۔ دوسرے بند کا آخری شعر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ چھٹے مصرعے میں یہاں بہ معنی لیکن فصحائے حال نے ترک کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب اس کے ترک کو حق بجانب نہیں سمجھتے کیونکہ اور بھی کئی جگہ یہ لفظ انہوں نے استعمال کیا ہے۔

طول کلام کے لحاظ و خیال سے مزید انتخاب کی ضرورت نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چودھری جگت موہن لال رواں نے

اس کتاب کے شروع میں جو پر مغز مقدمہ تحریر فرمایا ہے اس میں برق صاحب کی شاعرانہ قابلیت کو فلسفیانہ انداز میں کما حقہ ظاہر کر دیا ہے اور کتاب مذکور کا دیباچہ جناب اصغر گونڈوی نے رقم فرمایا ہے۔ اس میں بھی انہوں نے کلام کی تعریف و توصیف میں انصاف کا حق ادا کر دیا ہے۔ چودھری صاحب کے اس خیال سے ہمیں کامل اتفاق ہے کہ جناب برق صاحب انسان ہیں اور جب تک انسان انسان ہے اس سے خطائیں سرزد ہوتی رہیں گی۔ اس لیے اشعار کے اس بیش بہا خزانے میں کھرے اور رائج الوقت سکوں کے ساتھ اگر چند بے ٹکسال سکے بھی نکل آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مثلاً اوپر لکھے ہوئے اشعار میں ایک مصرع یہ ہے۔

تماشا گاہِ زمانہ کی سیر بھی کرے

یہاں تماشا گاہ کا آخری الف تخفیف میں آ گیا ہے۔ فارسی الفاظ میں یہ تخفیف درست نہیں۔ خاص کر الف کی تخفیف جو قدما کے کلام میں بھی نہیں ہے۔ اسی طرح فلسفۂ گیتا کے عنوان پر جو نظم کہی ہے۔ اس میں ایک شعر یہ ہے۔

تیغ آزما بھیشم سے ہوں ان میں کہ گورو سے
میدان کو سیراب کروں کس کے لہو سے

تیغ آزما کا آخری الف بھی تقطیع میں ساقط ہے لیکن ایسی چند فرو گذاشتوں سے جو مقتضائے طبیعت ہیں اور جن کے متعلق کسی کا یہ قول بالکل بجا ہے۔

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

چشم پوشی کرنا اور قابل مصنّف کی بہت سی شاعرانہ خوبیوں کو تسلیم کرنا ہی شرطِ انصاف ہے۔ مصنّف کی تصویر بھی شاملِ اشاعت ہے۔

کلام کی خوبی اور زمانے کی ناشناسی کے لحاظ سے یہ شعر جو تصویر کے نیچے مصنّف نے لکھ دیا ہے کس قدر دردناک ہے۔

کھِل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زادِ جہاں میں گلِ صحرائی تھا

دنیا میں بہت سے جوہر قابل ایسے ہیں۔ جن کے حال پر یہ شعر پورے طور سے صادق آتا ہے۔ ان کی یہ شکایت بالکل بجا ہے اور اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ بہرحال ہم برقؔ صاحب کو ان کی خوش بیانی کی داد دیتے ہیں۔ اور بسیار خوش گفتنی کہہ کر یہ درخواست کرتے ہیں کہ براہِ کرم ہمیں اس الزام سے بری سمجھا جائے۔

سر کتابت طباعت دیدہ زیب و فریب نظر ہے اور یہ مجموعہ کلام حسنِ ظاہر یا حسنِ باطن غرض ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

صبحِ نشاط

یہ منشی اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کا مجموعۂ کلام ہے۔
ضخامت چار سو صفحے۔ حسن ظاہر ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔
ابتدائی حصہ نظمیات کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ۲۶۰
صفحے تک نظمیں ہی نظمیں ہیں۔ اس کے بعد غزلیات ہیں۔ اس کے
بعد کچھ نظمیں بچوں کے لیے بھی ہیں۔ آخر میں عملیات ہیں یعنی
نظیر صاحب کا مزاحیہ کلام۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ صبحِ نشاط میں تنوع کا عالم
پیدا کرنے کی خاص کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش ہر لحاظ سے
کامیاب نظر آتی ہے۔ نظموں کے بعض عنوان بجائے خود اتنے
جاذبِ نظر ہیں کہ ہر عنوان ہی کو دیکھ کر مصنف کے میدانِ سخن
کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً پوسٹ مین۔ موٹر کار۔ طیارہ۔
کمیٹیوں کی حکومت۔ جج۔ ریڈیو۔ اندھا لڑکا۔ آشوبِ نسائیت۔
رجعت پسند لیڈر وغیرہ۔

فنی لحاظ سے بھی نظیر کا کلام پختہ ہے۔ چند مثالیں
ملاحظہ ہوں۔

رجعت پسند لیڈروں کی تعریف یوں کرتے ہیں

معترض کو چھوٹتے ہی کہتے ہیں رجعت پسند
اپنی رجعت دوستی کے کتنے پردہ دار ہیں

کمیٹیوں کی حکومت۔

ہر ایک ذی روح کی زبان پر فغاں و فریاد و آہ کیوں ہے
کمیٹیوں کی حکومتوں میں خدا کی بستی تباہ کیوں ہے
ہر ایک کوچہ مثیل صحرا تمام سڑکیں خراب و خستہ
اگر برس جائے ابر اک دن تو چار دن تک ملے نہ رستا

دیکھتا ہوں تمام تنگ شہر قیادت میں یہی پھر رہے ہیں ایک دو بیکار چندے کے لیے
پیچھے پیچھے طائفہ اللہ اکبر بر زباں آگے آگے طائفہ سالار چندے کے لیے

اس نہایت مختصر انتخاب سے ظاہر ہے کہ نظیر صاحب کا حسن طبیعت قابل داد ہے اور وہ اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

دہلی کا سلور جوبلی مشاعرہ

(اڑتیس سال پہلے کی روداد)

دہلی میں محترمی جناب پنڈت امرناتھ صاحب مدن ساحر دہلوی کا دم اردو ادب کی مسلسل خدمات کے لحاظ سے بسا غنیمت ہے۔ گذشتہ ۲۵ سال سے ان کے زیر اہتمام بزم سخن قائم ہے۔ اور اس کا مشاعرہ ہر مہینے باقاعدہ منعقد ہوتا رہا ہے۔ ماہ دسمبر کے آخر ایام میں اسی بزم کا سالانہ مشاعرہ بھی ہر سال ہوا کرتا ہے۔ اور اسی کے تمام اخراجات جناب ساحر دہلوی بذات خود برداشت کیا کرتے ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں سالانہ مشاعروں کا تھکا دینے والا کام اور انتظام و انصرام ان کے انہماک ادب اور ان کی مردانہ ہمت کا نمایاں ثبوت ہے۔ دسمبر سنہ ۳۶ء کا سالانہ مشاعرہ اسی بزم سخن کا سلور جوبلی مشاعرہ تھا اور اس میں شامل ہونے کے لیے موصوف نے مجھے بھی دعوت نامہ سے مفتخر فرمایا تھا۔ نیز ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء میں بہ تقریب مشاعرہ شملہ موصوف نے اپنے مشاعرہ میں شامل ہونے کے لیے زبانی وعدہ بھی مجھ سے لے لیا تھا۔ اس لیے ایفائے وعدہ کے خیال سے مجھے بھی وہیں جانا پڑا۔

سلور جوبلی مشاعرہ کے تمام اخراجات بھی حسب دستور جناب
ساحرؔ ہی نے اپنے ذمہ لیے ہوئے تھے اور اپنی خودداری کے زیر اثر
اس مشاعرہ کے لیے بھی کوئی چندہ جمع نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس مشاعرے
میں شامل ہونے کے لیے بہت سے مشاہیر دور دراز علاقوں سے۔
مدعو کیے گئے تھے اور وہ شامل بھی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی
مہمان نوازی اور مشاعرہ کو نشر کرنے نیز تمام شعرا کی عکسی تیار کرنے کے
اخراجات بھی کچھ کم نہ تھے۔ گویا خدمتِ ادب میں ساحرؔ صاحب کا یہ
مالی ایثار بھی موصوف کی ادبی خدمات کے ساتھ گراں تر ہے۔ جناب
حکیم آزادؔ انصاری حیدر آباد دکن سے تشریف لائے تھے۔ حضرت
احسن مار ہروی علی گڑھ سے جناب نوحؔ ناروی نارہ سے حضرت قمرؔ
بدایوں سے جناب سیمابؔ اور جناب بزمؔ اکبر آباد سے آکر شامل مشاعرہ
ہوئے تھے۔ ان اصحاب کے علاوہ گوالیار۔ جے پور اور الہ آباد وغیرہ
سے بھی شعراء شامل صحبت ہوئے تھے۔ بعض مشاہیر دہلی ہی میں
قیام فرماتے ہیں۔ مثلاً جناب فدا گلاؤٹھی شاگرد جناب داغؔ مرحوم۔
جناب بیخودؔ دہلوی۔ جناب نواب سائلؔ۔ جناب جوشؔ ملیح آبادی
مشاہیر کی اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مشاعرہ کس شان کا
ہوگا۔ ان بزرگوں کے علاوہ دہلی کے مقامی شعراء کی تعداد بھی یک صد
سے زیادہ تھی۔ ان میں جناب ساحرؔ دہلوی۔ جناب معجزؔ دہلوی۔
منشی جیونی پرشاد شیداؔ دہلوی اور زارؔ صاحب کے نام مجھے یاد ہیں۔
زارؔ صاحب کے دونوں صاحبزادے بھی اپنے والد محترم کے ہمراہ شامل جلسہ
تھے۔ جناب قمرؔ بدایونی کے صاحبزادے اخترؔ صاحب بھی اپنے

نامور والد کے ساتھ رونقِ محفل ہوئے۔ جناب صبرؔ گیا (بہار) سے تشریف لائے تھے۔ پنجاب کا نمائندہ صرف راقم الحروف ہی تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کا نمائندہ بھی صرف ایک تھا۔ افسوس کہ ان کا تخلص مجھے یاد نہیں رہا۔

شعراء کی یہ کثیر تعداد ایک دن میں تو ختم ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ہندی کا مشاعرہ بھی ہوا جو اس عظیم الشان مشاعرے کا تمہیدی حصّہ تھا۔ دو دن ہوتا رہا مگر اس میں شعراء کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک شاعر کو دو دو تین تین دفعہ پڑھنے کا موقع مل گیا مگر اُردو کا مشاعرہ شعراء کی کثیر تعداد کی وجہ سے ہر روز تین تین اجلاس منعقد ہونے کے باوجود دو دن میں بمشکل ختم ہوا۔ بایں ہمہ کسی صاحب کو دوبارہ پڑھنے اور طرحی کلام کے علاوہ کوئی اور غیر طرحی کلام سنانے کا موقع نہ مل سکا۔

جناب گلشنؔ الہ آبادی اس مشاعرے کے صدر تھے۔ انہوں نے یہ طویل صدارت نہایت استقلال سے جاری رکھی۔ اور آخری اجلاس میں بھی ایک بجے تک یہ تکلیف بہ طیب خاطر گوارا فرمائی۔ موصوف ایک مشہور عالم و فاضل اور کشمیری پنڈت ہیں۔ کالیستھوں کی طرح کشمیری پنڈتوں کا مذاقِ ادب بھی اردو و فارسی دونوں میں کسی سے پوشیدہ نہیں۔

جو مشاہیر اس عظیم الشان مشاعرے میں شامل ہوئے۔ ان میں صرف دو تین اصحاب ایسے تھے جن سے تعارف حاصل ہونے کا فخر اس سے پہلے بھی مجھے حاصل ہوا تھا۔ یعنی جناب نواب سائلؔ دہلوی حضرت سیمابؔ اکبر آبادی۔ جناب ساحرؔ دہلوی اور جناب جوشؔ ملیح آبادی سے ملاقات کا شرف شملہ وغیرہ کے مشاعروں میں بھی ہو چکا تھا۔ باقی

مشاہیر کو میں نے پہلی دفعہ اس مشاعرہ میں دیکھنے اور ملاقات کرنے کا فخر حاصل کیا اور اس لحاظ سے یہ مشاعرہ میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ ان میں ان بزرگوں کے دیدار فرحت آثار بصارت نواز ہوئے۔ جنہیں دُور دراز علاقوں میں سفر کرنے اور بہت سے اخراجات برداشت کرنے کے بغیر دیکھنا اور ملاقات سے خوش وقت ہونا دشوار ہے۔ مثلاً جناب قمر بدایونی۔ حکیم آزاد انصاری۔ جناب بزم اکبر آبادی۔ جناب احسن مارہروی۔ جناب نوح ناروی۔ جناب فدا گلاؤٹھی۔ جناب بیخود دہلوی وغیرہ۔ ان ملاقاتوں کا ایک دلچسپ منظر رہ تھا جبکہ محترمی نوح ناروی نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا۔ اور نہایت گرمجوشی سے معانقہ فرمایا۔ میں حیران تھا کہ کون صاحب ہیں جو اس قدر محبت اور خلوص سے حالات صحت پوچھ رہے ہیں۔ میں مصنوعی تعارف سے استفسارات کا جواب دے رہا تھا۔ اور ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ آخر میرا قیاس یقین میں تبدیل ہوا۔ اور میں جان گیا کہ بحر معانی کے شناور ناخدائے سخن فصیح العصر حضرت نوح ناروی بھی ہیں۔ اور یہی وہ خضر صورت الیاس سیرت ہیں جن کے اخلاق و اشفاق کا نقش میرے دل میں اس قدر استوار ہے کہ زمانے کا بڑے سے بڑا انقلاب بھی اسے معدوم نہیں کر سکتا۔ اس ملاقات کے بعد جناب دعا ڈبائیوی شاگرد حضرت نوح ناروی سے بھی تعارف ہوا۔ اسی ملاقات اور مابعد کی مختصر صحبتوں میں مجھے دعا صاحب کے اخلاق و انکسار کا بھی معترف ہونا پڑا۔ وہ جناب داغ مرحوم کے دوسرے شاگردوں کا بھی دیسا ہی احترام و ادب کرتے ہیں۔ جیسا اپنے نامور استاد

نوح ناروی کا۔ بہرکیف ان کے حسنِ عقیدت اور اخلاصِ معنوی سے میں بے حد متاثر ہوا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ پنجاب کے نوجوان شعراء میں مشاہیر اور اساتذہ کا یہ احترام اور یہ احساس کہ ہمیشہ سب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھیں بہت کم پایا جاتا ہے۔

اس مشاعرے کے لیے دو مصرع طرح مشتہر ہوئے تھے۔ ایک اردو ایک فارسی کا۔ اردو کا مصرع یہ تھا۔ اے نالہ نشاں جگر سوختہ کیا ہے
فارسی کا مصرع طرح یہ تھا۔ تنگ چشم گو نظرے جنت و کوثر کنم

حاضرین کی تعداد اگرچہ دہلی کی آبادی اور وسعت کے لحاظ سے بہت کم تھی۔ یعنی پانچ چھ سو سے زیادہ نہ ہوگی لیکن جس قدر تھی وہ سخن فہم اور ذوق آشنا تھی۔ صدر اور شعراء کو میز کے قریب کھڑے ہو کر پڑھنے اور لیکچرار بنانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اسٹیج کے بیچ طرف شعراء اور سخن شناس حضرات کو جگہ دی گئی تھی۔ شملہ کے مشاعروں میں جہاں نشست کا انتظام انگریزی ڈھنگ کے جلسوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ بڑی خرابی ہوتی ہے کہ امراء و رؤسا کو اسٹیج کے قریب جگہ دی جاتی ہے۔ اور سخن فہم و شعراء منتشر حالت میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کوئی کہیں کوئی کہیں۔ اس سے یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ داد دینے میں یک جہتی ہم آہنگی اور سرگرمی جو دہلی کے طریقِ نشست میں نمایاں تھی عشر عشیر بھی نظر نہیں آتی۔

پہلے دن کے عام اجلاس دہلی کے مقامی شعراء تک جن کی تعداد زیادہ تر نومشق اصحاب پر مشتمل تھی۔ محدود رہے۔ اس روز جو کلام پڑھا گیا وہ بہت معمولی حیثیت کا اور کسی طرح بھی دہلی کی شایانِ شان نہ تھا۔

بعض حضرات کا کلام عریانی اور پستی مذاق کے لحاظ سے قابل انگشت نمائی بھی تھا۔ ایک صاحب نے اردو کی طرح میں ساقط البحر غزل بھی پڑھ دی۔ ان کا کوئی شعر اصل بحر میں نہ تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایسے اصحاب کو اسٹیج پر آنے کی جرأت کس طرح ہو جاتی ہے۔ بہر حال پہلے دن کا مشاعرہ کلام کی نوعیت کے لحاظ سے بہت معمولی تھا۔ البتہ اسی رات جب مشاعرہ نشر ہوا تو اسی وجہ سے کہ اس کے لیے مشاہیر کا کلام منتخب کیا گیا تھا۔ صحبت پرلطف ہو گئی۔ راقم الحروف اس نشر میں دانستہ شامل نہ ہوا۔ انکار کی وجہ یہ تھی کہ مرکزی اسٹیشن کے سوا اور کسی جلسے میں آلات نشر لگائے جائیں تو وہاں کلام سنانے والوں کو فوجی ڈرل بھی کرنی پڑتی ہے اور اسے کبھی چند انچ آگے کبھی چند انچ پیچھے جانے نیز اپنی گردن خاص سطح کے سامنے رکھنے کا حکم ملتا رہتا ہے حالانکہ پڑھنے والا لطفِ کلام اور حسنِ بیان کی خوبیوں میں محو ہونے کی وجہ سے اس پابندی کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چونکہ شملہ کے براڈکاسٹ میں اس کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے یہ صدمہ شکریہ شرکت سے انکار کر دیا۔ اس براڈکاسٹ میں جو منتخب اور برگزیدہ مشاہیر کی وجہ سے قابل داد تھا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جناب بزم اکبرآبادی نے اپنی طرحی غزل میں سے جو آٹھ نو اشعار نشر کے لیے منتخب کیے۔ ان میں ایک شعر بوسہ کے مضمون کا بھی نشر کیا۔ ایک کہنہ مشق شاعر اور نامور کی زبان سے اس قسم کا شعر سُننا ہی اس زمانے میں قابلِ تعجب ہے۔ چہ جائیکہ اسے براڈکاسٹ کے لیے بھی منتخب کیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ شعر برسبیل تذکرہ نقل کر دینا بھی نامناسب ہے

چونکہ نومشق اور مقامی شعراء کی معقول تعداد ابھی باقی تھی

اس لیے دوسرے دن بھی دوپہر تک مشاعرہ ان اصحاب کے لیے مخصوص رہا۔ اور ایک بجے بعد دوپہر ان تمام شعراء کا جو اس مشاعرے میں شریک ہوئے، مجموعی فوٹو لیا گیا۔ اس فوٹو میں ۷۵ شعراء کی تصویریں شامل ہیں۔ کثرت تعداد کے لحاظ سے شعرا کا یہ فوٹو جس میں آل انڈیا حیثیت رکھنے والے شعراء کی بیشتر تعداد شامل ہے۔ ایک لاثانی اور قابلِ قدر چیز ہے۔ یہاں میں جناب ساحر دہلوی کو اس فروگذاشت پر متوجہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اس فوٹو میں شعراء کے نام چھپوانے کا انتظام نہیں کیا گیا۔ اور اس کے بغیر ان اصحاب کے لیے جو کسی کے صورت آشنا نہیں ہیں، یہ فوٹو مفید اور قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔ امید کہ موصوف اس کمی پر توجہ مبذول فرمائیں گے۔

اس کے بعد مشاعرے کا وہ اجلاس شروع ہوا جسے دہلی کی شان اور اردو ادب کا ایمان کہنا چاہیے۔ جتنے مشاہیر اس مشاعرہ میں شامل تھے ان سب نے اپنا اپنا کلام نوبت بر نوبت اس اجلاس میں سنایا۔ محترمی نواب سائل مدظلہ نے اپنی فارسی طرحی غزل پڑھی اور مہتمم مشاعرہ نے بہ حقیقت آشکار فرمائی کہ یہ پہلا موقع ہے کہ نواب صاحب نے مشاعرہ میں فارسی غزل پڑھ کر سنائی اور موصوف کی یہ خاص عنایت ہے جو انہوں نے میری درخواست کی تعمیل میں مجھ پر مبذول فرمائی ہے۔

جو بلند پایہ کلام اس اجلاس میں پڑھا گیا اس پر زبان دہلی جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ چونکہ جناب ساحر دہلوی اس مشاعرہ

کی روداد میں یہ تمام مجموعہ کلام شائع کرنے کا انتظام فرما رہے ہیں
اور بہت جلد یہ روداد کتابی شکل میں منظر عام پہ آنے والی ہے۔
اس لیے کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ طوالت کے خیال سے اس
مجموعہ کلام کا ضروری اقتباس درج کرنے کی ضرورت نہیں ردیف کیا
کے قافیہ میں بعض اصحاب کے اشعار۔ بطور نمونہ یہاں درج کر دیے
جاتے ہیں۔ تاکہ ناظرین مشاعرہ کی یہ مختصر روداد پڑھ لینے کے بعد
لطف کلام سے محروم نہ رہ جائیں۔ اس قافیہ کے متعلق بھی یہ اقتباس
مکمل نہیں مل سکا۔ اس لیے جس قدر مل سکا ہے وہی پیش کیا جاتا ہے۔

جناب شرر
شکوہ ہے یہی تجھ سے یہی تجھ سے گلہ ہے
پوچھا نہ کبھی تو نے تمنا تری کیا ہے

جناب ارشدی
جو زیست سے بیزار ہے تو اس سے خفا ہے
یہ ظلم نہیں ہے ستم ایجاد تو کیا ہے

جناب نہال
صہبائے مسرت کا تصور بھی خطا ہے
حسرت کے سوا خم کدۂ دہر میں کیا ہے

جناب صبر گیاوی
سنتا ہی نہیں میری سمجھتا ہی نہیں بات
دل میں نہیں معلوم سمایا ہوا کیا ہے

جناب معجز دہلوی
اے آہ کہاں ہے دل مرحوم کی تربت
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

درد

جناب جوش ملسیانی
درماندۂ تدبیر نہ ہوگا کوئی ایسا
کچھ کہہ نہیں سکتا مری تقدیر میں کیا ہے

جناب سیماب اکبرآبادی

اے منکرِ جذبات تجھے وہم ہوا ہے
ہے سوزِ ہوس تجھ میں تو پروانے میں کیا ہے
کیفیتیں سب دل کی ہیں نغمہ ہو کہ نوحہ
جو کچھ ہے وہ ہے ساز میں آواز میں کیا ہے

جناب نوح ناروی

لانا نہیں ایمان کوئی عشقِ دغا پر
یعنی وہی شک ہے وہی کیول ہے وہی کیا ہے
سب کہتے ہیں آفت ہے غمِ عشق بلا ہے
یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں کیا جانیے کیا ہے

ایضاً ہر وقت وہی تذکرۂ ترکِ محبت۔ یہ چھیڑ نہیں ان کی تو فرمائیے کیا ہے
ایضاً تو اس کو سمجھتا نہیں پوچھ اہلِ غرض سے۔ اقرار میں کیا ہے ترے انکار میں کیا ہے
ایضاً میں عرضِ تمنا نہیں کرنے کا زباں سے۔ بس دل ہی سمجھ لیجئے دل میں مرے کیا ہے
ایضاً درماں سے بڑھا اور بھی آزارِ محبت۔ منظور خدا جانے خدا کو مرے کیا ہے

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب نوح ناروی نے اس قافیہ پر سب سے زیادہ توجہ مبذول فرمائی ہے۔ اور زورِ طبیعت سے ہر شعر میں اسے نہایت خوبی سے نباہا ہے۔ اس غزل میں جناب ممدوح کا یہ شعر بھی امتیازی حیثیت کا ہے۔

ڈرتا ہوں کوئی آہ نکل جائے نہ منہ سے پردے میں ستم کے وہ مجھے جانچ رہا ہے

جناب قمر بدایونی کا بھی ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

یا ضعف سے خاموش ہے مجبورِ محبت
یا یہ کہ وہ انجامِ وفا سوچ رہا ہے

جناب دعا ڈبائیوی کا کلام بھی حضرت نوح ہی کے انداز کا عکس

ہوتا ہے۔ اس مشاعرہ میں بھی ان کی طرحی غزل اس خوبی سے مالا مال تھی۔ مجھے صرف مقطع یاد رہ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی

تاثیر نہیں خاک مگر نام دعا ہے

جناب جوش ملیح آبادی کا بلند آہنگ رندانہ کلام بھی بہت توجہ سے سنا گیا۔ اور یہ اجلاس شام کے پانچ بجے انہیں کی رباعیات پر ختم ہوا۔ آخری رباعی کا صرف ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے اور وہ یہ ہے۔

اے شیخ تو دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں

جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

جملہ مشاہیر کا بلند پایہ کلام ختم ہونے کے بعد رات کا اجلاس جو ایک بجے تک جاری رہا۔ فارسی طرح سے مخصوص تھا۔ جناب نوح ناروی بھی اس آخری اجلاس میں آخر تک تشریف فرما رہے۔ اور اجلاس کے آخری حصے میں انہوں نے حاضرین کے اصرار پر کچھ غیر طرحی کلام بھی سنایا اور حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ حضرت نوح ناروی نے اپنی اردو کی طرحی غزل سنانے سے پیشتر تین چار تمہیدی اور تعارفی شعر بھی پڑھے تھے۔ ان میں سے ایک رباعی اور ایک شعر مجھے یاد ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دعویٰ نہیں اس کا کہ سخنور ہوں میں بہتر نہیں یہ بات کہ بہتر ہوں میں

لیکن شرف نوح میرے نام میں ہے مانے کوئی اس کو تو پیمبر ہوں میں

چوتھے مصرعہ میں "مانے کوئی اس کو" یہ شرط بزرگوں کے احترام کے خیال سے کس قدر ضروری ہے۔ ان الفاظ نے اس دعوے کو جو سخن گسترانہ

ہے دعوے کی حیثیت سے یا ہر رکھا ہے۔ قابلِ داد نکتہ یہی ہے کہ اس محل پر ایسا کہنے کی اشد ضرورت تھی اس قسم کا طرزِ عمل جناب نوحؔ کی خصوصیات میں سے ہے۔ بزرگوں کے ادب و احترام میں سخن گسترانہ تعلّی بھی انہیں ممتاز رکھتی ہے۔ دو تعارفی شعر قطعہ کی صورت میں ادا کئے۔ مجھے آخری شعر یاد رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

اک طرف سائلؔ کا اعجاز اک طرف ساحرؔ کا سحر
اب تو میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ دلّی دُور ہے

اس وقت جناب سائلؔ اور جناب ساحرؔ سامنے بیٹھے ہوئے تھے اس لیے اس شعر نے اردو ادب کی خوبیوں کے علاوہ موقع محل کے لحاظ سے بھی خاص لطف پیدا کیا۔

فارسی کلام جو آخری نشست میں پڑھا گیا زیادہ تر صوفیانہ رنگ کا تھا۔ واضح ہو کہ دہلی کے شعراء کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تو صرف زبان لکھتا ہے۔ دوسرا حصہ زبان اور تخییل دونوں کو ہم پہلو رکھتا ہے۔ تیسرا حصہ متصوفانہ انداز کا دل دادہ ہے۔ فارسی بزم سخن میں زیادہ تر انہیں شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ جو تیسرے حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کلام بھی بہ حیثیت مجموعی بہت پختہ اور قابلِ ستائش تھا۔ الغرض یہ مشاعرہ نہایت شاندار اور یادگار حیثیت کا تھا۔ جو خوبیاں اوپر مذکور ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اس کی اور دو خصوصیتیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ شملہ اور پنجاب کے مشاعروں کا ایک معقول حصہ نعتانی ہوتا ہے۔ بعض گانے والے اور گا کر اپنا رنگ جمانے والے شعراء نے ان مشاعروں

کی فضا ان اصحاب کے لیے جو تحت لفظ یا زیادہ سے زیادہ سوز خوانی کی صورت میں پڑھتے ہیں، ناقابلِ شرکت بنا دیتی ہے اور انتہا یہ ہے کہ جسے گانا نہیں آتا۔ حاضرین یا تو اسے سنتے ہی نہیں اور سنتے ہیں تو نہایت بے اعتنائی اور بیزاری سے۔ مگر اس مشاعرے میں گا کر پڑھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اور باوجود اس کے حاضرین کامل توجہ بلکہ محویت سے سن رہے تھے۔ تمام اصحاب نے اپنا اپنا کلام اپنی عادت کے موافق تحت لفظ پڑھا۔ یہاں تک کہ جناب سائل دہلوی نے بھی جو ترنم اور تحت لفظ دونوں طرح پڑھنے اور کامیاب رہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اپنی ایک طرحی غزل تحت لفظ پڑھ کر سنائی۔ سیماب نے بھی اسی روش پر پڑھنا مناسب سمجھا۔ گویا اول سے آخر تک یہ مشاعرہ نغمہ سرائی کی لعنت سے پاک رہا

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ داد نہایت فراخ دلی اور نہایت یکجہتی و بلند آہنگی سے دی جاتی تھی۔ اچھا شعر خواہ کسی مبتدی کا ہو خواہ منتہی کا داد اور آفرین سے محروم نہ رہتا تھا۔ بعض دفعہ تو کسی نہایت اچھے شعر کی داد کے لیے سخن فہم حضرات ذوقِ سخن سے متاثر ہو کر اسٹیج تک آنے اور وہاں پہنچ کر داد دینے کی تکلیف گوارا فرماتے تھے۔ اور تو اور جناب معز گلاؤٹھی شاگرد جناب داغ مرحوم نے بھی باوجود اس پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے دو دفعہ اسٹیج تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی اور جی کھول کر داد دی۔ ایک دفعہ تو حضرت سیماب کے ایک شعر پر اور ایک دفعہ خاکسار راقم الحروف کے شعر مندرجہ ذیل پر

اے مست رعونت یہ جوانی نہ رہے گی
جس حسن پہ نازاں ہے وہ پر تول رہا ہے

ان دونوں خصوصیتوں نے بھی اس مشاعرے کی خوبیاں دوبالا کرنے میں بہت مدد دی۔ اور یہ شاندار مشاعرہ جس کی کامیابی کے لیے جناب ساحر دہلوی کی ان تھک محنت حسن انتظام مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سب کے دلوں میں ایک مستقل اور نہ مٹنے والی یادگار چھوڑ گیا۔ افسوس کہ جناب بیخود دہلوی اپنی علالت کی وجہ سے اس مشاعرے میں شامل نہ ہوئے اور صرف فوٹو کے وقت بہ صد مشکل شرکت فرما سکے۔

بزمِ اردو شملہ کا سالانہ مشاعرہ

یہ مشاعرہ ہمیشہ ماہ ستمبر میں جب شملہ کا موسم خاص طور سے خوشگوار ہوتا ہے منعقد ہوا کرتا ہے۔ اچھے اچھے مشاہیر کو شاملِ مشاعرہ کرنے کے لیے اراکین بزم کی جد و جہد فقط کاغذی گھوڑے دوڑانے تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اسی مقصد کے لیے وہ ذاتی رسوخ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مشاعرہ آل انڈیا حیثیت کا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ شملہ میں ایک اور بزم ادب بھی بزم کہسار کے نام سے موجود ہے۔ اور وہ بھی عدا گانہ ہستی کی نمود کے لیے دو سالانہ مشاعرے منعقد کر چکی ہے مگر جو کامیابی بزم اردو کے سالانہ مشاعرے میں نظر آتی ہے وہ بلا شبہ امتیازی حیثیت کی ہوتی ہے۔ شملہ کے مقتدر اصحاب کی بیشتر تعداد اس مشاعرہ میں شامل ہوتی ہے اور اس کی وجہ اراکین بزم کی سرگرم مساعی ان کا ذاتی رسوخ اور ان کی خدمات کی مقبولیت و اعتراف ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ جس طرح ہندوستانیوں کے نظامِ معاشرت اور ہر قسم کی سیاسی و تمدنی تحریکوں میں ہر جگہ نفاق و افتراق کی خرابیاں بلائے بے درماں کی طرح موجود ہیں۔ ہمارے ادبی مشاغل بھی اس لعنت سے پاک نہیں ہیں۔ ایک ہی شہر میں ایک ہی مقصد کے لیے

دو جداگانہ انجمنوں کی نمود اور جداگانہ مشاعروں کا وجود اسی
افتراق کی روشن مثال ہے۔ غیر جانب دار شعراء بھی جو ہر دو
مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ اس تفریق کے اثر سے محفوظ نہیں
رہ سکتے کیونکہ اگر وہ ایک بزم کے مشاعرے میں شامل ہوں اور دوسری
بزم کا دعوت نامہ کسی خاص وجہ سے قبول نہ کر سکیں تو ان پر جانب داری
کا الزام عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ شملہ کے ایک مقامی شاعر محض اسی وجہ
سے اس سال کسی مشاعرے میں شامل نہیں ہوئے۔ مقامی حیثیت کی وجہ
سے یہ احتیاط فی الواقع بجا معلوم ہوتی ہے۔ ان حالات میں ہر دو بزم
کے اراکین سے جن کی ادبی خدمات کے احساس کا راقم الحروف کو
اعتراف ہے۔ یہ درخواست کرنا بے جا نہ ہوگا کہ براہ کرم وہ اپنے
ذاتی اور مقامی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر سالہائے ماسبق کی
طرح ایک ہی بزم ادب کا وجود شملہ کے لیے خیال فرمائیں اور اگر کسی
بزم کا نام اس تصفیہ میں سدّ راہ ہو تو بہتر ہے کہ بعد تصفیہ
کوئی اور نام تجویز کر لیا جائے۔ مشاعرے خواہ ایک سے زیادہ
منعقد ہو جائیں لیکن بزم ایک ہی رہے اور یہ افتراق اتحاد کی صورت
میں تبدیل ہو جائے۔ خدمت ادب کے واحد مقصد کے لیے ایک ہی
شہر میں جداگانہ انجمنوں کا وجود کسی پہلو سے بھی پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

شملہ جیسے مقام میں آل انڈیا حیثیت کا مشاعرہ منعقد کرنے
کے لیے جو مصارف درکار ہیں وہ ہزار بارہ سو روپے سے کسی
طرح کم نہیں ہو سکتے۔ ڈیڑھ ہزار کے قریب سامعین کو کرسیوں
پر بٹھانے کے لیے جتنی جگہ درکار ہے اتنی وسعت کے ہال شملہ

میں صرف دو ہی ہیں اور اپنی چند گھنٹے استعمال کرنے کے لیے ساٹھ ستر روپے کرایہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ فرنیچر کا کرایہ اور اس کی باربرداری کے اخراجات مزید برآں۔ مہمانوں کے سفر خرچ کے علاوہ جو یا تو سیکنڈ کلاس کا ہوتا ہے یا انٹر کلاس کا۔ ہوٹلوں کے اخراجات اس قدر گراں ہیں کہ اگر پانچ چھ مہمان اپنے دوستوں کے ہاں قیام پذیر ہو جائیں تو بزم شملہ دو ڈیڑھ سو روپیہ کی زیر باری سے بچ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ اخراجات تین دن کے لیے ہی واجب الوصول ہوتے ہیں۔ اخراجات کی یہ رقم کچھ مقامی امرأ اور روٴسا سے چندہ جمع کر کے حاصل کی جاتی ہے اور کچھ مشاعرہ پر ٹکٹ لگا کر وصول کی جاتی ہے۔ ٹکٹ کی شرح آٹھ آنے سے کم نہیں ہوتی۔

جس مشاعرہ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے وہ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو زیر صدارت جناب سر سلطان احمد ممبر تجارت (گورنمنٹ آف انڈیا) منعقد ہوا۔ اور دس بجے صبح سے سات بجے شام تک جاری رہا۔ اس سال ٹکٹ کی شرح کم سے کم ایک روپیہ تھی۔ اور اس کے باوجود حاضرین کی تعداد بارہ تیرہ سو سے کم نہ ہو گی۔ سیوائے ہال میں جہاں یہ سماعت نواز جلسہ منعقد ہوا۔ تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہی تھی۔ بیسیوں اصحاب ٹکٹ خریدنے کے باوجود بیٹھنے کے لیے جگہ حاصل نہ کر سکے اور کھڑے ہونے پر مجبور ہوئے۔ چونکہ مزید سامعین کی آمد کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا اس لیے اراکین بزم کو ٹکٹوں کی فروخت بند کرنی پڑی۔ اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بزم اردو کا یہ مشاعرہ ٹکٹ کی کم سے کم شرح دو چند کر دینے کے باوجود شرکائے جلسہ کی تعداد

اور ان کے اشتیاقِ شرکت کے لحاظ سے کتنا کامیاب رہا۔ حاضرینِ مشاعرہ میں سے مقتدر اصحاب کے علاوہ شیخ عبدالحئی وزیرِ تعلیم سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعظم پنجاب اور سر جگدیش پرشاد ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام اصحاب آخری وقت تک مشاعرہ میں تشریف فرما رہے۔

باہر سے جو شعرا اس مشاعرے کے لیے مدعو کیے گئے تھے ان میں سے حضرت جگر مرادآبادی اور مولانا حسرت موہانی اسی سال اپنے خاص مواقعات کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ اور ہر دو اصحاب کی عدم شرکت کو سب نے محسوس کیا۔ مقامی شعرا کے علاوہ جو اصحاب اس مشاعرہ کی زینت ہوئے۔ ان میں نواب سائل دہلوی۔ حضرت بیخود دہلوی۔ مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی۔ قدیر لکھنوی۔ بیزار لکھنوی۔ روشن صدیقی۔ احسان دانش۔ فراق گورکھپوری۔ آغا مرادآبادی۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ تنویر لکھنوی۔ پنڈت زتشی کاٹ مالویہ اور عرش ملسیانی قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت فانی بدایونی تشریف آور نہیں ہوئے۔ مگر موصوف نے اپنی دو بہترین غزلیں مشاعرہ میں پڑھوا دینے کے لیے حیدرآباد سے ارسال فرمائی تھیں۔ ان حضرات میں سے صرف منشی رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری ہی ایسے شاعر تھے کہ راقم الحروف کو اس سے پہلے ان کی صورت و سیرت سے کوئی تعارف حاصل نہ تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ رائل ہوٹل شملہ کے اس کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ جہاں جناب فراق فروکش تھے۔ تین دن خوب لطف صحبت حاصل ہوتا رہا۔ فراق صاحب بہت وسیع المشرب آدمی ہیں۔ فکر شعر

ذکرِ شعر یا تحقیقِ فن کے سوا اور کسی مشغلہ یا بحث کو پسند نہیں فرماتے۔
بہت اچھا اور بہت پختہ کہنے والے ہیں۔ قابل شاعر ہونے کے علاوہ
قابل ادیب اور قابل مضمون نگار بھی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے مذکور الصدر میں سے
ہر ایک کے متعلق چند الفاظ بطور تعارف یہاں درج کیے جائیں۔
چونکہ حاضرینِ مشاعرہ شعراء کے متعلق بھی تعارف کا تقاضا کرتے
تھے جو ہمہ گیر شہرت کے مالک ہونے کی وجہ سے دنیائے ادب
میں کسی تعارف کے لیے محتاج نہیں۔ اس لیے ناظرینِ رسالہ ہذا
سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہر ایک سخنور کے متعارف ہوں گے
درست نہیں۔

نواب سائل دہلوی ـــ عمر تقریباً ۷۰ سال۔ شکل و شباہت میں نہایت
وجیہہ داغ مرحوم کے داماد اور ان کے سربرآوردہ
تلمیذ رشید۔ مسلمہ قابلیت اور شہرت کے مالک ہیں۔ رنگِ قدیم میں
استادانہ زورِ بیان ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ تحت لفظ اور ترنم
دونوں میں بہت اچھا پڑھتے ہیں۔

حضرت بیخود دہلوی ـــ عمر تقریباً ۷۲ سال۔ حضرت داغ کے نامور
شاگرد دہلی کے سرمایۂ ناز اور زبانِ دہلی کے
بہترین نمائندہ ہیں۔ رنگِ قدیم میں استادانہ عظمت کے مالک ہیں۔

مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی ـــ لکھنؤ کے کہنہ مشق اور باکمال شاعر
ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں۔ اور تحت لفظ
پڑھتے بھی بڑی نوک جھونک سے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں آبِ حیات

بہاتے ہیں۔

بہزاد لکھنوی۔ لکھنؤ کے نوجوان شاعروں میں سے ہیں۔ علمیت زیادہ نہیں۔ عارضہ اختلاج قلب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور اس کا اثر کم کرنے کے لیے ایک سفید رومال گلے میں باندھ کر ہر وقت اسے گردش میں رکھتے ہیں تاکہ آواز کا توازن قائم رہے۔ ترنم میں پڑھتے ہیں۔ خوش الحانی اور خوش گوئی کا بہترین مجموعہ ہیں۔

منور لکھنوی۔ منشی دوارکا پرشاد صاحب افق مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ منشی بشیشور پرشاد نام ہے۔ غزل بھی خوب کہتے ہیں مگر طبیعت نظم کی طرف زیادہ مائل ہے۔ تحت لفظ پڑھتے ہیں۔ رنگ جدید پسند فرماتے ہیں۔

روش صدیقی۔ جوالاپور متصل ہردوار کے رہنے والے نوجوان شاعر ہیں۔ ادبی جرائد میں ان کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ بلند آواز سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زورِ کلام بھی اسی کوشش کا متقاضی ہوتا ہے۔ مگر امراض سینہ کے اثرات سے مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کلام بہت پاکیزہ اور جذبات عالیہ کا دلکش مرقع ہوتا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں رنگِ جدید میں کہتے ہیں۔ کلام میں سیاسی پہلو بھی ہوتا ہے۔

حفیظ ہوشیارپوری۔ رسالہ ادبی دنیا کے نوجوان ایڈیٹر ہیں۔ ایم اے بھی ہیں۔ رنگ جدید میں خوب کہتے ہیں۔

احسان دانش۔ مدتوں سے پنجاب ہی میں رہتے ہیں۔ کاندھلہ (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ مزدور اور کسان کی مصیبت

کے بیانات ان کے خاص مضامین ہیں۔ غریب آدمی ہیں۔ اس لیے
غریبوں کی تکالیف خوب سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ ترنم میں بلند آہنگی سے
پڑھتے ہیں۔ کلام میں تکلفات لفظی ضرورت سے زیادہ ہیں۔

قدیر لکھنوی۔ لکھنو کے نوجوان شاعر ہیں۔ مالویہ صاحب کی طرح
کھدر اور گاندھی ٹوپی پہنتے ہیں۔ اور بلاشبہ
اس عزت کے مستحق ہیں کہ بڑے مشاعروں میں مدعو کیے جائیں۔ زیادہ
تر غزل کہتے ہیں۔ مگر اس کا رنگ زمانہ حال کے مذاق غزل سے متناسب
ہوتا ہے۔

پنڈت کرشنا کانت مالویہ۔ مرکزی اسمبلی کے ممبر اور کانگرس کے
سرگرم کارکن۔ کلام میں پختگی تو نہیں
ہوتی۔ مگر اس میں ہلکا سیاسی رنگ ضرور ہوتا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں
اسی انداز میں کہتے ہیں۔

عرش ملسیانی۔ پنڈت بالمکند بی اے پنجاب کے نوجوان شاعر
ہیں۔ اور راقم الحروف کے فرزند ہیں۔ ترنم میں
پڑھتے ہیں۔ ناظرین ان کا کلام رسالہ ہذا میں بھی اکثر ملاحظہ فرماتے
رہتے ہیں۔

فانی بدایونی۔ لاہور اور مسلمہ قابلیت کے شاعر ہیں۔ جناب
قمر بدایونی اور جناب بیخود بدایونی کی طرح یہ بھی
بدایوں کے سرمایہ ناز ہیں۔ کلام میں یاس اور ناکامی کے مضامین زیادہ
ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ غزل میں ان کا میدان سخن یہی ہے۔
آج کل حیدر آباد میں تشریف رکھتے ہیں۔

بوم میرٹھی ظریفانہ رنگ میں کہنے والے بوم میرٹھی بھی رونقِ محفل تھے۔ اچھا کہتے ہیں۔ مگر مضامین زیادہ تر عامیانہ مذاق کے ہوتے ہیں۔ ان کے ایک بند میں طوائف سے آشنائی ہونے کا مذکور بھی تھا۔ چونکہ مشاعرہ میں خواتین بھی موجود تھیں۔ اس لیے سیکرٹری صاحب نے انہیں اس بند پر روک دیا۔ ان کے کلام پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان کے تخلّص پر ضرور کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ظریف شعراء کو اس قسم کا تخلّص تجویز کرتے وقت تماشی کا جوکر نہ بن جانا چاہیے۔ انہیں یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ سنجیدہ طبیعت کے آدمی انہیں کس نام سے آواز دیں گے اور کس طرح مخاطب کر سکیں گے۔ اصل نام سے بہت کم احباب آگاہ ہوتے ہیں۔ خطابت میں ہمیشہ تخلّص ہی استعمال میں آتا ہے۔ بوم صاحب تو وہ کہنے سے رہے (بوم کے ساتھ صاحب کا پیوند بھی ملاحظہ ہو) اس صورت میں ان اصحاب کے لیے خطاب کی وہ کونسی صورت تجویز فرماتے ہیں۔ تخلّص کی یہ خرابی اس وقت اور بھی قبیح ہو جاتی ہے جب شاعر صاحب ذرا دور تشریف رکھتے ہوں اور انہیں بلند آواز سے پکار کر صدہا حاضرین کے سامنے یہ کہنا پڑے کہ بوم صاحب یہاں تشریف لائیے۔

۱۹ ستمبر کو جب کہ جناب صدر مشاعرہ کی کوٹھی پر دس بارہ شعرا کی دعوت تھی اور وہاں ان کا فوٹو بھی لیا گیا تھا۔ اس خرابی تخلّص نے لطیفہ بھی قباحت پیدا کر دی جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے

کھانا کھا چکنے کے بعد چند شعراء اور اراکین بزم اردو کوٹھی کے

ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ابھی چند اصحاب اور میزبان کھانے ہی کے کمرے میں تھے۔ بوم صاحب ڈرائنگ روم کے دوسرے گوشے میں تنہا بیٹھے ہوتے تھے۔ اراکین بزم میں سے سیّد تنویر علی نے چاہا کہ انہیں بھی یہاں بلوا لیا جائے۔ میں نے سیّد صاحب سے پوچھا کہ آپ کیا کہہ کر انہیں مخاطب کریں گے۔ فی الواقع وہ بھی اس شش و پنج میں تھے۔ آخر جب کوئی اور تجویز نہ سوجھی تو کچھ دبی زبان سے یہی کہہ دیا کہ بوم صاحب۔ اتنا ہی کہا تھا اور "تشریف لے آئیے" کہنا باقی تھا کہ خندۂ بے اختیار نے یہ الفاظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ آس پاس کے سب آدمی ہنسی ضبط کر رہے تھے مگر ضبط نہ ہوتی تھی۔ خود سیّد صاحب اس قدر بے اختیار ہو گئے کہ ہنستے ہنستے پنچ سے فرش پر آ رہے۔ اور ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ خیریت یہ گذری کہ بوم صاحب کے کانوں تک آواز نہیں پہنچ سکی اور وہ وہیں تشریف فرما رہے۔ ورنہ قریب آ کر یہ نظارہ دیکھتے تو خدا جانے کیا خیال فرماتے۔ اتنے میں جناب میزبان صاحب و حضرت بیخود و مرزا ثاقب بھی اس کمرے میں تشریف لے گئے لیکن ان اصحاب کا احترام بھی ان ہنسنے والوں کو متین و سنجیدہ بنانے میں کارگر نہ ہو سکا۔

احمق پھپھوندوی۔ بھی بلحاظ تخلص اسی قبیل سے ہیں۔ کیوں کہ وہ بھی سیاسی عنوانوں پر شعر کہنے والے ایک نوآموز شاعر ہیں۔ پاگل تخلص فرماتے ہیں۔ ایک سالانہ مشاعرے میں فہرست شعراء صدر مشاعرہ کے ہاتھ میں تھی۔ جب ان کی باری آئی اور صدر صاحب نے انہیں اسٹیج پر بلانا چاہا۔ تو شش و پنج میں

پڑ گئے۔ اور سوچنے لگے کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ آخر لکھے ہوئے
تخلص پر انگلی رکھ کر سیکریٹری صاحب سے کہا کہ اب انہیں بلائیے اور
اور اس طرح اپنی مشکل جو اخلاقی احساس سے پیدا ہوئی آسان کی۔ یہ
علیحدہ بات ہے کہ ایسے شعراء کو بھری محفل میں بھی اس قسم کے فضول
تخلص سے مخاطب کرنے میں عار نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بے تکلف
دوستوں کے سوا دوسرے سنجیدہ طبع اصحاب کی زبان انہیں اس
قسم کے نام سے مخاطب کرنا کس طرح گوارا کر سکتی ہے۔ نیز انہیں یہ بھی
سوچنا چاہیے کہ شاعر کی ظریفانہ طبیعت اور اس کے مزاحیہ کلام کو
تخلص کی بیہودگی سے کیا تعلق ہے۔

یہ مشاعرہ ساڑھے پانچ بجے شام سے ساڑھے چھ بجے شام تک
براڈکاسٹ بھی ہوا۔ براڈکاسٹ کو بھی زمانہ حال کا ایک رواج بلکہ فیشن
کہنا چاہیے۔ پانچ پانچ منٹ کے لیے بارہ شعراء اس میں شامل ہوئے۔
براڈکاسٹ بھی نہایت کامیاب رہا۔ بمبئی اور مدراس تک سے مشاعرہ
بالکل صاف سنائی دینے کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ اور کامیابی مشاعرہ
پر مبارکباد کے برقی پیام شملہ میں پہنچے۔ جناب بیخود دہلوی بھی
احترام کے خیال سے اس براڈکاسٹ میں شامل کر لیے گئے تھے۔ مگر
انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں تو جیوں کی طرح اٹن شن کی پوزیشن میں
کھڑا ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محویت کلام کے اثر سے
سراپا بے خود ہو کر بارہا معزز حاضرین کی طرف اپنے چہرے کا رخ
کر لیتے تھے اور ہر دفعہ انہیں ایسا کرنے سے مؤدبانہ منع کیا جاتا
تھا۔ اور اشاروں ہی اشاروں میں بار بار گذارش کی جاتی تھی۔ کہ منہ اسی

"الہ نشر ہی کی طرف سے کیجیے۔ چونکہ مجھے اس مشکل پوزیشن کا ایک دفعہ
تجربہ ہو چکا تھا۔ اور اس خیال سے اب محتاط رہتا ہوں۔ اور اس
عزت کو قبول کرنے سے بہ صد شکریہ انکار کر دیتا ہوں۔ اس
لیے میرے لیے یہ منظر بہت ہی دلچسپ ثابت ہوا۔

کراچی کے نامور رئیس نے براڈ کاسٹ کرنے والوں میں سے
چار آدمی اپنی پسند کے مطابق انعام کے لیے منتخب کیے اور
بزم اردو شملہ کے صدر کی معرفت انہیں انعام تقسیم کر دیے گئے۔
ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ پنڈت بالمکند عرش ملسیانی	۱۰۱ روپیہ
۲۔ احسان دانش	۱۰۱ روپیہ
۳۔ پنڈت کرشن کانت مالویہ	۱۰۱ روپیہ
۴۔ بہزاد لکھنوی	۱۰۱ روپیہ

مالویہ صاحب نے اپنی سیر چشمی و استغناء کی وجہ سے یہ انعام
مختلف یتیم خانوں میں تقسیم کر دینے کی ہدایت بھیج دی۔ اور اس ہدایت
کی تعمیل کی گئی۔

الغرض یہ مشاعرہ جس کی کیفیت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر
پہلو سے اس قدر کامیاب تھا کہ اس کے لیے جناب اسد ملتانی اور
سید تنویر علی (بزم اردو کے سیکرٹری صاحبان) اور ان کے سرگرم
معاونین بزم معززی جناب شیخ غلام محمد صاحب صدر بزم اردو و ڈپٹی
ڈائرکٹر پوسٹ آفس ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا) تمام دنیائے ادب کی طرف سے
مبارک باد اور دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

لاہور کا مشاعرہ

آل انڈیا نمائش پنجاب جو لاہور میں ۲۴ دسمبر سے ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء تک نظر نواز رہی۔ تماشائیوں کی تفریح اور تفنن طبع کے لیے مصنوعات نادرہ کے ساتھ ساتھ اور بہت سے مشاغل بھی رکھتی ہے۔ مثلاً بچوں کے کھیل تماشے قمار بازی کے ترقی یافتہ اڈے موٹر چلانے کے مقابلے پھسلنے گھاٹ۔ مدور ہنگوڑے اور اسی قبیل کے بیسیوں کھیل وہاں کھیلے جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ پہلوانان پیل تن کی زور آزمائی بھی ہوتی اور پہلوانان سخن کی انجمن آرائی بھی۔ مورخہ ۳۰-۳۱ دسمبر کو ایک عظیم الشان مشاعرہ کی انجمن دو دن ہوتی رہی۔ یہ ریویو اسی مشاعرہ سے متعلق ہے۔

اس مشاعرے کے لیے تین عنوانات نظموں کے لیے مشتہر کیے گئے تھے۔

(۱) ہمارا وطن (۲) دیہات کا ایک منظر (۳) مقصدِ حیات۔

انجمن اردو پنجاب کی طرف سے ایک طلائی میڈل بھی کسی ایسی بہترین نظم کے لیے برائے انعام مشتہر ہوا تھا۔ جو مذکورہ بالا

عنوان میں سے کسی ایک عنوان پر ہو۔ اس انجمن کے سیکرٹری میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء مالک رسالہ "ہمایوں" اور صدر جناب پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی ہیں۔ میاں بشیر احمد صاحب اردو زبان کی خدمت گذاری میں جس قدر منہمک رہتے ہیں، اس انہماک کی مثال پنجاب میں تو نہیں مل سکتی۔ خود رسالہ "ہمایوں" اس خدمت گذاری کا نمایاں ثبوت ہے۔ موصوف نے اس مشاعرہ کے انتظام و اہتمام میں جس سرگرمی سے دوڑ دھوپ کی اور جس طرح اسے کامیاب بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ کسی امیر اور خاص کر کسی ہندوستانی امیر سے اتنے کام اور اتنی محنت شاقہ کی توقع نہیں ہو سکتی۔

دوسرا انعامی میڈل بہترین غزل کے لیے کرنال شاپ انارکلی لاہور کی طرف سے تھا۔ غزلیات کے لیے تین مصرعے طرح مشتہر ہوئے تھے۔

(۱) حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا (داغؔ مرحوم کی مشہور غزل کا مصرعہ حا وغیرہ قافیہ)

(۲) صد شکر کہ پھر زیست کا سامان نظر آیا (پنہاں آسان وغیرہ قافیہ)

(۳) پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے (محفل وغیرہ قافیہ)

تیسرا میڈل منتظمین مشاعرہ کی طرف سے ایک بہترین مزاحیہ نظم کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے لیے کسی خاص مصرع طرح یا کسی خاص عنوان کی کوئی قید یا پابندی نہیں تھی۔

گورنمنٹ نے اس مشاعرہ کا اہتمام انجمن اردو پنجاب کے سپرد

کیا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ انتخاب بہت صحیح اور نہایت موزوں تھا۔ لاہور کی کوئی انجمن اس مشاعرہ کو شاید اتنا کامیاب نہ بنا سکتی، جتنا انجمن اردو پنجاب اور اس کے سرگرم سیکریٹری صاحب اور ان کے شرکائے کار کی مساعی جمیلہ سے یہ کامیاب ہوا۔ لاہور کے مشاعرے عام طور پر اس قدر بدنام ہوتے ہیں کہ معقول پسند اور متین طبیعت کے شعراء اب ان میں شامل ہونے سے محترز رہتے ہیں:۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گانے والے اور مغنی شعرا نے سامعین کا ذوق سماعت جن کی بیشتر تعداد کالجوں کے نوجوانوں اور رنگین مزاج طالب علموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس قدر بگاڑ رکھا ہے کہ وہ صرف خوش گلو شعراء ہی کو سنتے ہیں اور تحت لفظ پڑھنے والوں کو دو تین شعر پڑھنے کا بھی موقع نہیں دیتے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ شعراء خواہ وہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں اور امتیازی حیثیت کے مالک ہوں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ لاہور میں ادبی خدمت گزاری کی دعویدار تین چار جماعتیں ہیں۔ جو کسی ایک جماعت کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعرہ میں اپنا رقابتی فرض ادا کرتی رہتی ہیں۔ اور یہ مد مقابل جماعت کو بدنام کرنے نیز شعراء کو اس جماعت سے متنفر کرنے کا یہ زریں موقع غنیمت سمجھتی ہیں۔ وہ اپنے منظور نظر اصحاب کے سوا اور کسی کو داد ہی نہیں دیتیں۔ خرابی یہیں تک محدود نہیں جو جماعت اپنے اہتمام سے کوئی مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔ اس کے ارکان خود بھی اسی اصول پر کاربند رہتے ہیں اور دوسری جماعت

کے شعراء کو داد دینے میں انتہائی بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں تھوڑی بہت فراخ دلی اگر ظاہر بھی کرتے ہیں تو اس میں بھی تعریض یا تضحیک کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی جماعت نے انعقاد مشاعرہ سے پیشتر اپنے ارکان کو متنبہ کر دیا ہے کہ اپنے آدمیوں کے سوا اور کسی کو داد نہ دی جائے۔ بد مذاق طالب علم ہر جماعت کے ہاتھ میں آلہ کار ہوتے ہیں اور ہر ایک جماعت کے کارکن پس پردہ تار ہلاتے رہتے ہیں۔ ان ہر دو وجہوں سے لاہور کے مشاعرے اور ان کے ساتھ خود اہلِ لاہور کئی سالوں سے بدنام ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں نہ تو کسی کامیاب مشاعرہ کی کسی کو امید ہو سکتی تھی اور نہ معقول پسند شعراء کا شامل ہونا قابلِ یقین تھا۔ راقم الحروف نے بھی دعوت نامے کے جواب میں انہیں وجوہ پر صاف لفظوں میں انکار لکھ بھیجا تھا۔ مگر جناب سیکرٹری صاحب کے یہ اطمینان دلانے پر کہ شکایت اگرچہ درست ہے مگر اس کا پورا سدباب کیا جائے گا۔ دعوت نامہ منظور کر لیا تھا۔

انجمن اردو پنجاب نے اس سنجیدہ شکایت کو قطعی طور پر دور کر دینے کے لیے دو موثر تجاویز اختیار کیں۔ ایک تو یہ کہ مشاعرہ پر آٹھ آنے۔ اور ایک روپیہ اور تین روپیہ کی شرح سے ٹکٹ لگا دیئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بد مذاق اصحاب کو شامل مشاعرہ ہونے کا موقع نہ مل سکا اور وہی اصحاب شامل ہو سکے جو فی الواقع سننے کا شوق اور شعر فہمی

کا ذوق رکھتے تھے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ مشاعرہ ہونے سے پہلے ہر ایک کرسی پر اس مطبوعہ اپیل کا ایک ایک کاغذ رکھ دیا جائے جس میں سامعین کی توجہ لاہور کے دامن ادب سے یہ بدنما داغ دھو دینے کی طرف مبذول کی گئی تھی۔ اور ان سے زوردار الفاظ میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ براں کرم لاہور کے مشاعرے کو بدنام ہونے سے بچائیں۔ یہ تجویز بہت موثر ثابت ہوئی۔ سامعین نے ہر قسم کا رطب و یابس بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کسی مبتدی اور نو مشق کے نتائج افکار سے تھا یا کسی مشتی اور پختہ گو شاعر کے نوادر افکار سے۔ بڑے صبر و استقلال سے اور کامل یکسوئی و سکوت سے سُنا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض دفعہ صبر آزما وقت بھی آتا رہا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے صرف ایک دفعہ سُننے سے انکار کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعر کی آواز اس قدر کمزور اور نحیف تھی کہ قریب کے چند آدمی بھی اسے بہ مُشکل سُن سکتے تھے اور سوء اتفاق سے اس وقت لاؤڈ سپیکر جو شروع شروع استعمال کیا جاتا تھا سازشکستہ بن چکا تھا۔ اس صورت میں سامعین کا بے چین ہو جانا قدرتی امر تھا۔

لاہور میں جتنے بڑے مشاعرے آج تک منعقد ہوئے ہیں۔ ان پر ٹکٹ لگانے کا رواج بہت کم ہے اگر ہے بھی تو اس کی شرح کبھی دو آنہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے انجمن اُردو پنجاب نے بڑھائی ہوئی شرح کا خیال رکھ کر ایک ہزار نشست کا

انتظام کیا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ یہ تمام نشستیں بھر جائیں گی۔ اس کے علاوہ ۳۰ دسمبر کو مطلع بھی ابر آلود تھا۔ ترشح بھی ہو رہا تھا۔ لاہور کی سردی ویسے بھی پنجاب میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ موسمی تغیر نے اس میں اور بھی اشتداد پیدا کر دیا۔ اس کے علاوہ مشاعرہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ زور کی بارش شروع ہو گئی اور شام تک ہوتی رہی۔ جس نمائش میں دو دو ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ آدمی روزانہ شامل ہوتے رہے بارش اور انتہائی سردی کی وجہ سے وہاں دو ڈیڑھ سو بھی نظر نہ آتے تھے۔ مگر بایں ہمہ مکان مشاعرہ (انجینیرنگ ہال واقعہ نمائش پنجاب) کی ہر ایک نشست پُر نظر آتی تھی۔ اور مکان مشاعرہ سے باہر برآمدے میں بھی مشتاقان سخن صرف آواز سننے کی کوشش میں مصروف تھے۔

مشاعرہ کی دو نشستیں تو ۳۰ دسمبر کو صبح دس بجے سے چھ بجے شام تک ہوئیں۔ ایک بجے کے قریب ایک گھنٹہ کا وقفہ تفریح اور طعام وغیرہ کے لیے رکھا ہوا تھا۔ تیسری نشست ۳۱ دسمبر کو ایک بجے دوپہر سے شروع ہو کر ساڑھے چھ بجے شام تک جاری رہی۔ پہلی نشست کے صدر عالی جناب دیوان نریندر ناتھ صاحب ایم۔ اے ممبر اسمبلی پنجاب تھے۔ موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں مشاعروں کی تاریخ بیان فرمائی اور فارسی زبان کے مختلف تقریبی اشعار جو بعض واقعات سے وابستہ تھے بطور مثال پیش کر کے اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دیا۔ باقی دو نشستوں کے صدر عالی جناب سر عبدالقادر بالقاب ممبر انڈیا کونسل لندن تھے جو حسن اتفاق سے رخصت پر تشریف

لائے ہوتے تھے ۔

مخدومی سر عبد القادر صاحب کی ادب نوازی اور سخن شناسی
کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں ۔ حق یہ ہے کہ کسی ایسے مشاعرے
کے لیے جو حدود پنجاب میں ہو موصوف سے بہتر صدر مشاعرہ اور
کوئی نہیں ہو سکتا ۔ اس مشاعرہ کی خوش نصیبی اس کی کامیابی اس
کی عظمت اور اس کی شان میں کیا شک ہو سکتا ہے ۔ جس کے
صدر سر عبد القادر صاحب ہوں ۔ موصوف کی زندہ دلی اور وقتاً
فوقتاً لطافت طبع کا اظہار ان کے صحیح ذوق سخن کے ساتھ مل کر
ہر بزم سخن کو اس قدر شاداب و شگفتہ بنا دیتا ہے کہ بزم
ساقی کی شگفتگی بھی اس کے سامنے تہی جام نظر آتی ہے ۔

اس مشاعرہ میں جسے آل انڈیا مشاعرہ کہنا چاہیے شعرائے
پنجاب کے علاوہ جو شعراء شامل ہوئے ان میں جناب جوش ملیح آبادی
اثر رامپوری ۔ سراج لکھنوی ۔ بدر غازی پوری ۔ قدیر لکھنوی ۔
ساغر نظامی اور روشن صدیقی قابل ذکر ہیں ۔ شعرائے پنجاب بھی
بہت زیادہ تعداد میں شامل صحبت تھے ۔ صوبہ کا مرکزی مقام ہونے
کی وجہ سے لاہور ہی میں شعرائے اردو کی تعداد اتنی زیادہ ہے
کہ کسی مشاعرہ کو دو دن تک جاری رہنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے ۔
س کے علاوہ پنجاب کے مختلف حصوں سے بھی متعدد شعراء رونق
محفل تھے ۔ ان اصحاب میں جناب کیفی دہلوی ۔ حفیظ ہوشیار پوری ۔
مولانا حامد علی خاں حامد ۔ مولانا تاجور نجیب آبادی ۔ پروفیسر تپش ایم اے
حضرت الطاف مشہدی خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر

سابق گورنر کشمیر۔ پنڈت بالمکند عرش ملسیانی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے۔ پرنسپل رام پرشاد صاحب۔ پروفیسر عابد علی عابد۔ پروفیسر فیض احمد خاں بہادر۔ احمد یار خاں دولتانہ۔ پنڈت ونشہ پرشاد صاحب فدا۔ ناشاد ایم اے۔ خواجہ دل محمد ایم اے۔ احسان دانش۔ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے۔ حاجی لق لق صاحب۔ جلال الدین صاحب اکبر۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ سردار اودے سنگھ شائق فیروزپوری۔ تاجور سامری۔ دینا ناتھ مست کاشمیری اور میاں بشیر احمد صاحب قابل ذکر ہیں۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انعامی مقابلے میں کن کن شعراء نے شرکت کی۔ اس کی وجہ یہ ہے ایسے شعراء کے لیے اپنا کلام اعلان کردہ عنوانات نظم یا مصرع ہائے طرح کے ماتحت چار دن پیشتر بھیج دینا ضروری تھا۔ مشاعرہ میں صرف اس قدر بتایا گیا کہ یک صد سے زیادہ شعراء نے اس مقابلے میں حصہ لیا اور ان میں سے تین اصحاب میڈل کے لیے منتخب ہوئے۔ تنگی وقت کی وجہ سے صرف انعامی نظموں یا غزلوں ہی کو سامعین کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس لیے یہاں صرف ان منتخب اصحاب کے نام معہ اقتباس کلام نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(۱) اعلان عنوانات نظم پر جو نظمیں مقابلہ کے لیے وصول ہوئیں ان میں سے محترمہ زیب عثمانیہ۔ بیگم ایس بہاء الدین کی نظم میڈل کے لیے منتخب کی گئی۔ یہ نظم مقصد حیات کے عنوان پر تھی جو حامد صاحب مدیر رسالہ "ہمایوں" لاہور نے پڑھ کر سنائی۔ اس انعامی نظم

کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ اُردو زبان میں ایک خاتون کی یہ خوش گوئی فی الواقع قابلِ ستائش ہے۔

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جدا سمجھ
شاہدِ دل نواز کی یہ بھی کوئی ادا سمجھ

اُن کی آرزو نہ کر اُن کی آرزو ہے موت
ہر نفسِ حیات کو درد میں مبتلا سمجھ

منزلِ ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند
مہر و مہ نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ

تیرے حریمِ قطب کی خاک میں جب جمود ہے
فتنہ کوئی اٹھا سمجھ حشر کوئی بپا سمجھ

(۲) دوسرا میڈل جو طرحی غزل کے مخصوص تھا۔ پنڈت بال مکند عرشؔ ملسیانی کو دیا گیا اور میڈل عطا کرتے وقت صاحب صدر نے فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ یہ انعام ایک پنجابی نے حاصل کیا ہے۔ اور پنجابی بھی وہ جو دوآبہ کا رہنے والا یعنی پنجاب کے ایک گوشے کا باشندہ ہے۔ عرشؔ صاحب کی طرحی غزل پہلے مصرع طرح پر تھی۔ یہ غزل انہوں نے مشاعرہ میں پڑھ کر سنائی اور بہت پسند کی گئی۔ چند اشعار اس غزل کے بھی ملاحظہ ہوں۔

زخمِ دل بھی دکھا کے دیکھ لیا بس تمہیں آزما کے دیکھ لیا
داغِ دل سے بھی روشنی نہ ملی یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لیا
مژدہ اے حسرتِ دلِ پر شوق اس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا
نہ گئی ان کی تمکنت نہ گئی بارہا سر جھکا کے دیکھ لیا

جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے ان کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا
آبرو اور بھی ہوتی پانی اشک حسرت بہا کے دیکھ لیا
ترکِ الفت کے سن لیے الزام راز دل کے چھپا کے دیکھ لیا

کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرشؔ
سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

(۳) تیسرا انعام جو مزاحیہ کے لیے مشتہر ہوا تھا۔ حاجی لق لق مدیر اخبار "احسان" لاہور کے حصے میں آیا۔ یہ نظم بھی لق لق نے مشاعرہ میں پڑھی اور خوب داد حاصل کی۔ اس وقت بزم مشاعرہ کشت زعفران بنی ہوئی تھی۔ اور تین سے تین آدمی بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی متانت و ثقاہت چھوڑ بیٹھے تھے۔ یہ نظم بھی مقصدِ حیات ہی کے عنوان پر تھی۔ مسدس کے ہر بند میں حیات انسانی کے جداگانہ مقصد بیان کیے گئے تھے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

زندگی کیا چیز ہے کس دیس کی سوغات ہے
آؤ ہم بتلائیں کیوں جیتے ہیں ہم کیا بات ہے
زندگی اِک نمائش گاہِ مصنوعات ہے
چار دن بجلی کے لیمپ اور پھر اندھیری رات ہے
آئے ہیں دنیا میں ہم کچھ کام کرنے کے لیے
کچھ خدا سے اور کچھ بیوی سے ڈرنے کے لیے

مصنوعات کی نمائش میں جہاں بجلی کے بے شمار لیمپ لگائے گئے تھے۔ کھڑے ہو کر تیسرا اور چوتھا مصرع پڑھا جائے تو جو لطف سامعین میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کا اندازہ ناظرین بخوبی کر

سکتے ہیں۔ چوتھے مصرعے کا محاورہ زبان میں جو تھوڑا سا تصرف کیا گیا ہے۔ وہ کتنا برمحل اور پر لطف ہے۔ چھٹے مصرعے کی خوبی تعلیقات میں شامل سمجھنی چاہیئے۔ اب دوسرا بند ملاحظہ فرمائیں۔

ہے جوانوں کے لیے سینما میں جانا زندگی
جیب میں پائی نہ ہو ٹائی لگانا زندگی

مہ وشوں سے باغ میں آنکھیں لڑانا زندگی
غسل خانے میں اکیلے گنگنانا زندگی

کشتی بازی اور موسیقی نہیں تو کچھ نہیں
اور کچھ کچھ وے سے دلچسپی نہیں تو کچھ نہیں

آج کل کے نوجوانوں کی آوارگی طبع اور فیشن پرستی اس بند میں بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہے۔ چوتھا مصرع اس بند میں بھی تعلیقات سے وابستہ ہے۔ اس کے بعد غریب شعراء پر یوں برستے ہیں۔

شعر کہنا بھی بنا جاتا ہے جزو زندگی — نام چھپ جانا رسالے میں ہے حدِّ شاعری
نثر میں اشعار کہہ دینا ہے ایک صنعت نئی — اور اگر یہ بھی نہیں خالی تخلّص ہی سہی

نام کے ساتھ ایک دو الفاظ کی دم چاہیئے
شعر بے معنی سہی لیکن ترنم چاہیئے

اس کے بعد ان اشعار پر توجہ مبذول فرماتے ہیں جو غالب پرستی کے طوفان میں بہے جا رہے ہیں۔ وہ غالبؔ کی تقلید میں کچھ ایسے وارفتہ ہو رہے ہیں۔ کہ شعر گوئی اور معمّہ گوئی میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ اس پر یہ کہ بلند بانگ دعویٰ کہ ہم تو غالبؔ کے رنگ میں کہتے ہیں۔ کتنا عجیب ہے۔ اس بند میں ایسے شعراء کی

خوب خبر لی گئی ہے۔ آخری چار مصرعے ایسے ہی شعراء کا نمونہ کلام ظاہر کرنے کے لیے بند میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان شعراء کا مقصد حیات بھی کتنا دلچسپ ہے ملاحظہ ہو۔

عہد آزادی عروض قید کے قائل نہیں | اور اگر ہو بھی تو ایسے شعر کچھ مشکل نہیں
ترعش جذبات قلب مرتسم ساحل نہیں | نکہت عارض شمیم فطرت حاصل نہیں

سبزہ شوریدہ سرآوارۂ الزام ہے
محمل لیلی سرود ارغنوں در جام ہے

لیڈروں کا مقصد حیات بھی ایک بند میں کتنا خوب کہا ہے۔

سامنے مسجد کے گانے پر بھی جھگڑا چاہیے | اور کبھی قومی ترانے پر بھی جھگڑا چاہیے
پھر کبھی تو ذبح خانے پر بھی جھگڑا چاہیے | اور کبھی کونسل میں جانے پر بھی جھگڑا چاہیے

بن کے لیڈر سور ہے تو زندگی کس کام کی
امن قائم ہو گیا تو لیڈری کس کام کی

لق لق صاحب نے پہلے مصرع طرح کی زمین کو بھی آب تعلیقات سے سیراب کیا تھا۔ اس غزل کے اشعار بھی بہت پر لطف اور ان کے مخصوص رنگ میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی سنتا نہیں فغان غریب | ریڈیو پر بھی گا کے دیکھ لیا
نہیں ملتا ہمارے دل کا سراغ | ایکسرے بھی کرا کے دیکھ لیا
میرے دل کی لگی نہیں بجھتی | برف میں دل لگا کے دیکھ لیا
موت بھی ہم سے بھاگتی ہے دور | کار کے نیچے آ کے دیکھ لیا
یہ جراثیم عشق مر نہ سکے | ہم نے ٹیکا کرا کے دیکھ لیا

تیسرے مصرع طرح پر بہت سے شعراء نے زور طبیعت دکھانے

کی کوشش کی تھی مگر یہ زمین کی خرابی تھی کہ بن جائے اور ہو جائے کا تصادم ہوتا تھا۔ صرف بن جائے کو نباہنا مشکل تھا۔ ہر غزل میں دو تین شعر ایسے ضرور تھے جن میں یہ دونوں پہلو پائے جاتے تھے۔ ہم آہنگی کے خیال سے یہاں صرف دو اشعار اقتباس کی صورت میں درج کیے جاتے ہیں۔ جن میں صرف دل کا قافیہ ہے۔

کیفی دہلوی۔
پریشانی سے تنگ آیا ہوں پھر دم بخود ہوں میں
کہ ہم آہنگ سوزِ دل کا سازِ دل نہ بن جائے

سراج لکھنوی:۔
ملا کر خاک میں چنتے ہو کیوں اب منتشر ذرّے
تمہارا ہاتھ لگنے سے کہیں پھر دل نہ بن جائے

تاجور نجیب آبادی۔
بھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظران کی
یہ دل داری حساب دوستاں دردِ دل نہ بن جائے

شائق فیروز پوری۔
ابھی اس سے محبت میں بہت کچھ کام لیتے ہیں
یہ بیتابی کہیں بڑھ کر سکونِ دل نہ بن جائے

پرنسپل ناشاد۔
نہ وا ہو اے مری چشم تمنا دید کی خاطر
کہیں شوقِ نظارہ سنگِ راہ دل نہ بن جائے

پرنسپل تاثیر:۔
وہی بے تابیاں اس کی وہی بے باکیاں اس کی
یہ اب تک جو مرا دل تھا یہ تیرا دل نہ بن جائے

جوش ملسیانی:۔
وہ حسرت کیا جو آنکھوں سے نہ ٹپکے اشک بن بن کر
وہ ارماں کیا جو آخر اضطرابِ دل نہ بن جائے

چونکہ مشاعرہ میں غزل یا نظم پڑھنے کے لیے مصرع طرح یا عنوان نظم کی کوئی پابندی نہ تھی اس لیے مختلف قسم کے کلام میں جو

وہاں پڑھا گیا تنوع پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ یہ تنوع بھی اس مشاعرہ کی خصوصیات میں سے تھا کیوں کہ ایک شاعر غزل پڑھ جاتا تھا تو دوسرا سیاسی رنگ یا وطن پرستی کی کوئی نظم سنا کر محظوظ کر دیتا تھا۔ کسی نے چرخ کے گیت میں واقعات حاضرہ کا موقع پیش کر دیا۔ تو کسی نے تلمیحات سے مسحور کیا۔ کسی نے ہندی طرز کے دوہے اردو زبان میں نذر سامعین کیے۔ اگر ان کے صرف عنوان بیان کر دیے جائیں تو اس تنوع کا جس کا مذکور ابھی ہوا ہے کس قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

عنوانات حسب ذیل ہیں۔

پردہ۔ مقصد حیات۔ ہمارا وطن۔ دیہاتی مناظر۔ صبح بہار۔ سرمایہ دار۔ پیمان وفا۔ جہان آزاد۔ خرابات۔ دیہاتی لڑکی۔ قومی ترانہ۔ شجاعت وغیرہ۔ خواجہ دل محمد صاحب ایم۔اے نے دوہے سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ ان کا نمونہ بھی ملحوظ ہو۔

اب کی اب کے ساتھ ہے جب کی جب کے ساتھ
جس کی رب کے ساتھ ہے اس کی سب کے ساتھ

٭ ٭

ننکا سا اک نہر پر لہر بہاتی ہے
تن کا دھوکا ہے من سے من کی ہائے

جھلمل جھلمل کر رہے تارے سبھی برات
کس دولہا کے منتظر بیٹھے ساری رات

بچہ دیکھ عکس کو کھیلے اس کے ساتھ
پیار کرے کے جھنجلائے ہاتھ آئے نہ لیکن ہاتھ

حاضرین مشاعرہ میں مستورات کی تعداد بھی تیس چالیس سے کم نہ تھی. ان خواتین میں ایک ایسی خاتون بھی موجود تھی جس نے ایروپلین میں ۱۹ ہزار فٹ کی بلندی تک جوہر پرواز دکھا کر پانچ دریاؤں کی سرزمین میں ریکارڈ قائم کیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ شاعر کے طائر خیال کی طرح خواتین بھی عالم بالا کی سیر کر سکتی ہے۔

تیسری نشست کے خاتمے پر میاں صاحب موصوف نے بہ کمال اشتیاق راقم الحروف سے دریافت کیا کہ کہیئے ۔ اب تو آپ کو مشاعرہ لاہور اور اہل لاہور سے کوئی شکایت نہیں ۔ اس استفسار کا جواب، اظہار اطمینان اور اظہار تشکر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال یہ مشاعرہ ہر پہلو سے کامیاب رہا۔ سامعین کی بشیر تعداد نے سیکرٹری صاحب کی خدمت میں یہ خواہش ظاہر کی کہ اس قسم کا ایک مشاعرہ ہر سال ضرور منعقد ہوا کرے ۔ اس خواہش سے بھی ظاہر ہے کہ انجمن اردو پنجاب کی کوشش اس مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لیے کتنی مشکور اور کتنی قابل تعریف ہے ۔ جو کلام اس مشاعرہ میں پڑھا گیا اس کا بہت سا حصہ رسالہ ’’ہمایوں‘‘ کے ایک خاص نمبر میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

٭ ٭ ٭

ہارڈنگ لائبریری دہلی کا

سالانہ مشاعرہ

یہ مشاعرہ ۱۸ - ۱۹ - ۲۰ مارچ ۳۹ء کو مسٹر فصیح الدین صاحب
بی۔ اے سیکرٹری کے انتظام اور جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دہلی
کے اہتمام میں منعقد ہوا تھا۔ چوں کہ ہارڈنگ لائبریری میونسپل
کمیٹی کی قائم کردہ ہے۔ جسے نیم سرکاری ادارہ کہنا چاہیے۔ اس
لیے اس مشاعرہ کو بھی نیم سرکاری مشاعرہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ
غیر طرحی صحبتیں تھیں۔ چار نشستوں کے لیے چار برگزیدہ اصحاب کو
صدارت کے لئے تکلیف دی گئی تھی۔ پہلی نشست ۱۸ مارچ کو رات
کے آٹھ بجے سے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہوئی۔ دوسری ۱۹ مارچ
کو بعد دوپہر منعقد ہوئی اور چار بجے ختم کر دی گئی۔ دونوں کی
صدارت سر تیج بہادر سپرو کو تفویض کی گئی تھی۔ جن کی ادب
پروری اور اردو دوستی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ تیسری نشست اسی مارچ کو
رات کے آٹھ بجے شروع ہو کر بارہ بجے ختم ہوئی۔ اس نشست کے لیے
سر محمد یعقوب صدر تجویز ہوئے تھے۔ مگر وہ کسی مصروفیت کی

وجہ سے تشریف فرما نہ ہو سکے۔ اس لیے یہ صدارت جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دہلی کے حصے میں آئی جو ایک انگریز ہیں۔ چوتھی نشست ۲۰ مارچ کو ۸ بجے شام سے ۱۲ بجے تک بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ وقت تک جاری رہتی مگر ایک وجہ سے جس کا ذکر آگے آئے گا ساڑھے گیارہ بجے ختم کر دی گئی۔ اس کی صدارت تین گھنٹے، آنریبل سر سید رضا علی نے فرمائی۔ جن کی سخن شناسی اور زندہ دلی ہر مشاعرہ کو شگفتہ اور کامیاب بنا دینے کی کفیل ہوا کرتی ہے اور ان کے بعد سر محمد یعقوب کو تفویض ہوئی۔

مشاعرہ کے لیے ٹاؤن ہال کی عمارت تجویز کی گئی تھی۔ چونکہ ٹکٹ نہیں لگایا گیا تھا اور عام داخلہ کی صورت میں ہال کی وسعت کثرت حاضرین کی گنجائش نہ رکھتی تھی اس لیے اس خرابی کے انسداد کے لیے شہر کے با مذاق اصحاب کے نام داخلہ کے پاس جاری کر دیے گئے اور صرف یہی اصحاب ہال میں داخل ہونے کے مجاز تھے اس محدود داخلہ کے باوجود حاضرین کی تعداد پانچ سو سے کم نہ ہوگی۔ ہال میں اور سٹیج پر کوئی جگہ کہیں خالی نظر نہ آتی تھی۔ دس بارہ خواتین بھی ہر نشست میں شامل بزم رہیں۔ ان کے لیے اگرچہ پردہ کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ مگر ان خواتین کو یہ بات ناپسند صبح بھی نہ تھی۔

مقامی شعرا کی کثیر تعداد بھی اس مشاعرہ میں شامل تھی۔ ان میں نواب سائل دہلوی۔ جناب بیخود۔ جناب آغا شاعر قزلباش۔ حضرت فدا گنّاؤٹی (جو دہلی میں قیام فرماتے ہیں) جوش ملیح آبادی۔

پنڈت امرناتھ مدن ساحر۔ مسٹر چنڈی پرشاد شیدا کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جناب سائل دہلوی کے فرزند عزیز القدر نیمج اپنی، خوش نوائی اور بلند آہنگی کی وجہ سے نیز جناب بیخود دہلوی کے شاگرد رشید حکیم چندولال صاحب اپنی خوش گوئی و پختہ کلامی کی وجہ سے زینت مشاعرہ کہے جا سکتے ہیں۔ باہر سے بھی بہت سے مشاہیر کو شریک محفل ہونے کے لیے تکلیف دی گئی تھی۔ مثلاً حضرت احسن مارہروی۔ جناب نوح ناروی جناب سیماب اکبرآبادی۔ جناب آزاد انصاری۔ مولانا قمر بدایونی۔ بسمل الہ آبادی۔ ساغر نظامی راقم الحروف عزیزی عرش ملسیانی۔

ان اصحاب کے علاوہ مقامی اور غیر مقامی نوجوان شعراء کی ایک معقول تعداد ایسی تھی جنہیں ان کی خوش گوئی اور حسن طبیعت کے لحاظ سے بلاشبہ زینت محفل کہا جا سکتا ہے۔ شعرا کی تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مشاعرہ آل انڈیا مشاعرہ کی حیثیت کا اور دہلی کی شان کے شایان تھا۔ اسے کامیاب بنانے کے لیے متعلقہ مشاہیر اردو کو دور دراز علاقوں سے طلب کرنے طویل سفر کی تکلیف دینے اور سفر و سہ روزہ قیام دہلی کے اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ منتظمان جلسہ کی یہ کوشش خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ دہلی کے دو مشہور اساتذہ جناب سائل دہلوی اور جناب آغا شاعر قزلباش کو ان کی شدید علالت کے باوجود شریک بزم کیا گیا۔ نواب سائل دہلوی ایک سال سے اپنے پاؤں مضروب کی وجہ سے اس قدر ماؤف ہیں کہ زمین پر کھڑے ہونا درکنار چارپائی سے اٹھنے اور

وہیں سے بیٹھنے کے لیے بھی سہارے کے محتاج ہیں۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ موصوف کو ان کے دولت کدہ سے جس کی کرسی بھی کافی اُونچی ہے، کس طرح کار میں بٹھایا گیا ہوگا اور کس طرح ٹاؤن ہال کی اُونچی کرسی پر لایا گیا ہوگا۔ جناب آغا شاعر قزلباش اس قدر علیل اور اس قدر نحیف تھے کہ ان کی صورت بھی مشکل سے پہچانی جاتی تھی۔ دوران سر کی وجہ سے چند منٹ بھی بیٹھنے کے ناقابل تھے۔ ضعف و نقاہت کی وجہ سے ان کی غزل بھی ان کے ایک عزیز نے پڑھ کر سنائی۔ مگر منتظمان جلسہ نے اس عالم میں بھی انہیں سٹیج پر لاکر بٹھا دیا۔ ہر دو اساتذہ مذکور کی آرام کرسیاں جس طرح چار چار آدمی اُٹھا کر ہال میں لائے اور پھر اُونچی سٹیج (ڈائس) پر جس کے چار زینے تھے ان آرام کرسیوں کو لاکر رکھا یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ اس غیر معمولی تصدیہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ دہلی کا مشاعرہ اساتذہ دہلی کے کلام سے اور حاضرین ان ہر دو مشاہیر کی زیارت سے محروم نہ رہ جائیں جن کی پیرانہ سالی زبان حال سے ان کے نامور اُستاد کا یہ مقطع سب کو سنا رہی ہے۔

اب داغ کا یہ حال ہے دم جیسے ہو باقی
خورشید لب بام ہیں یہ شمع سحر ہیں

مشاعرہ کی پہلی اور دوسری نشست میں براڈکاسٹ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ پہلی نشست میں تو صرف تین چار شعراء ہی کا مگر دوسری نشست میں جو ۱۹ جولائی کو بعد دوپہر ہوئی تقریباً بیس شعرا کا کلام نشر کیا گیا۔

بہت سے مشاہیر اردو کو شامل مشاعرہ کرنے کے علاوہ اس مشاعرہ کے بعض امتیازی وخصوصی پہلو اور بھی ہیں۔ جن کا مذکور اس روداد میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دہلی کا شوق سخن ہے۔ وہ ہر ایک نشست میں اوّل سے آخر تک نہایت صبر واستقلال کے شامل بزم رہے اور ہر قسم کے رطب یابس کمال خوشی ومتانت سے سماعت فرماتے رہے۔ چارنشستوں میں سے ایک کی صدارت بھی جو بعض حالات میں صبر آزما بھی ہوجاتی ہے گوارا فرمائی۔ مشاعرہ کے شروع میں افتتاحی تقریر جو غالباً کسی فاضل ادیب سے لکھوائی ہوگی انہوں نے خود پڑھ کر سنائی۔ اس تقریر کے پڑھتے وقت موصوف کا لب ولہجہ بالکل ہندوستانیوں ہی کا تھا۔ ان کے انداز قراءت صحت لفظ مدالصوت اور قصرالصوت سے کسی کو یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ مضمون کوئی انگریز پڑھ رہا ہے۔ البتہ اس مضمون میں جو خدمت ادب کے ترغیب سے تعلق رکھتا تھا۔ جہاں کہیں کوئی فارسی کا شعر آجاتا تھا۔ وہاں ان کے یوروپین ہونے کا راز فاش ہوجاتا تھا۔ ورنہ اس مضمون کے باقی حصوں کی قراءت میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ تقریر کسی ہندوستانی ادیب کی ہے۔

شعرائے دہلی کی طرف سے موصوف کو اس تکلیف فرمائی کے لیے ایک منظوم سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ یہ سپاسنامہ جو مطبوعہ اور خوبصورت چوکھٹے میں جڑا ہوا تھا۔ پنڈت امرناتھ صاحب مدن ساحر دہلوی نے بزم میں ہراڈ کاسٹ کیا اور خلوص دل

سے موصوف کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دوسری نشست میں جناب کمشنر صاحب بہادر دہلی بھی تشریف لائے اور ان کی خدمت میں بھی اسی طرح کا ایک مطبوعہ سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ یہ خدمت بھی جناب ساحرؔ دہلوی ہی کے سپرد تھی۔ دوسری نشست کے خاتمے پر ٹاؤن ہال ہی کی عمارت کے وسیع صحن میں ایک پُر تکلف دعوت چائے نوشی بھی ہوئی جس میں تمام شعراء اور صدر صاحبان نیز ہر دو حکام والا مقام شامل ہوئے۔ اس تقریب کے بعد پندرہ بیس شعراء کا فوٹو بھی لیا گیا۔

نشست اوّل کے صدر جناب سر تیج بہادر سپرو کی افتتاحی تقریر جو اُردو زبان کی خدمت اور اس کی فضیلت کے موضوع پر تھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ اگر اُردو زبان کی خدمت اس اصول پر مبنی ہو کہ ناخواندہ اصحاب بھی اس کو بخوبی سمجھ سکیں اور اس میں وہ الفاظ خواہ سنسکرت کے ہوں خواہ عربی و فارسی کے نہ بھرے جائیں۔ جو پہلے کبھی سننے میں نہ آئے تھے۔ تو میں اس کی حمایت و سرپرستی میں سب سے آگے رہوں گا۔ انہوں نے اس زبان کے تمام اہل قلم سے درخواست کی کہ وہ اپنی تصنیفات میں مقبولیت عام کے مقصد سے اگر اس اصول کو بنیادی اصول قرار دیں تو یہ اس زبان کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ اور اگر اس میں ایسے الفاظ کی بھرتی جاری رہے گی۔ جو کسی ڈکشنری میں بھی نہیں ملتے تو پھر اُردو کو کسی اور دشمن کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی الفاظ جو متعارف ہو چکے ہیں۔ ان پر

کبھی یہی اصول عائد ہوتا ہے۔ میونسپلٹی کو بلدیہ اس کے ممبروں کو ارکان بلدیہ۔ ٹکٹ کو بلیطہ والنیٹر کو مندوب اور اس کی جمع مندوبین بائیکاٹ کو مقاطعہ سول نافرمانی کو مقاطعۂ مجہول کہنے کی کوشش کبھی مقبول اور کامیاب نہیں ہو سکتی۔

کلام کی نوعیت کے لحاظ سے غیرطرحی مشاعرہ ہمیشہ قابل ستائش ہوتا ہے۔ اس قسم کے مشاعرے میں شعراء ہمیشہ اپنا چیدہ کلام و منتخب کلام پڑھتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو کلام پڑھا گیا وہ کس حیثیت اور کس پائے کا تھا۔ جس مشاعرے میں بیسیوں مشاہیر اُردو شامل ہوں۔ اس کے متعلق تو ان کے اسمائے گرامی ہی کی فہرست سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیش کردہ کلام کس شان اور عظمت کا ہوگا۔ اس کلام کا بیشتر حصہ اگرچہ غزلیات کی صورت میں تھا مگر رباعیات و نظمیات کی تعداد بھی معقول تھی۔ مکرمی جناب نوح ناروی نے دلی کی عظمت پر جو رباعیات اس مشاعرہ کی دو مختلف نشستوں میں ارشاد فرمائیں بہت پرلطف اور بہت برجستہ تھیں۔ چونکہ ان رباعیات کی نقل جناب ممدوح نے راقم الحروف کو حسب الطلب ارسال فرمائی ہے۔ اس لیے وہ یہاں بصد شکریہ درج کی جاتی ہیں۔

اے نوح اٹھ اپنا دکھاتے جانا
یہ کس نے کہا تھہر نہ ڈھائے جانا
گنگا ہے اگر دور تو دلی کی قسم
جمنا ہی میں طوفان اٹھاتے جانا

دلّی کی فضا میں چُپ نہ رہنا سیکھا
استاد جہاں سے شعر کہنا سیکھا
اے نوحؔ کرے گی غرق جمنا کیوں کر
طوفانِ سخن میں ہم نے بہنا سیکھا

＊

صورت دلّی میں پھر دکھائی تو نے
چل کر نارہ سے داد پائی تو نے
اے نوحؔ بہائی سب نے اُلٹی گنگا
اُلٹی جمنا مگر بہائی تو نے

＊

آرائش و زینت کوئی دل سے پوچھے
تشریحِ وجاہت کوئی دل سے پوچھے
پوچھے کوئی مجھ سے مرے دل کا رُتبہ
دلّی کی حقیقت کوئی دل سے پوچھے

＊

کوئی یہ جتاتا ہے کہ اُلفت ہے مجھے
دعوٰے یہ کوئی کرتا ہے نسبت ہے مجھے
اے نوحؔ سناتے ہیں سب اپنی اپنی
دلّی کی مگر دل سے عقیدت ہے مجھے

＊

مغموم بہت رہیں گے دلّی والے
آزار و ستم سہیں گے دلّی والے
فردوس میں بھی تباہ ان کا ہے محال
دل دلّی کہیں گے دلّی والے

＊ ＊ ＊

آٹھ دس نظمیں بھی جو مختلف عنوانوں کے ماتحت اپنے رنگ میں فرد تھیں اس مشاعرہ میں پڑھی گئیں۔ اور خوب سرسبز ہوئیں۔ مگر اس قسم کے نیم سرکاری مشاعرہ میں سیاسی نظم پڑھے جانے کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ جناب جوش ملیح آبادی کی سیاسی نظم بڑے شوق سے حاضرینِ جلسہ نے سنی اور اس کی داد بھی بڑی گرم جوشی سے دی مگر منتظمانِ جلسہ کو یہ

نظم بہت ناگوار خاطر ہوتی۔ جب کوئی شاعر نظم پڑھنے کے لیے سٹیج پر آتا تو ان اصحاب کے کان کھڑے ہو جاتے تھے اور انہیں یہی خوف دامنگیر ہوتا تھا کہ مبادا یہ نظم کسی سیاسی موضوع پر ہو۔ جس سیاسی نظم کا ابھی ذکر ہوا جب اس کا پہلا مصرع پڑھا گیا تو آنریبل سر سید رضا علی جو آخری نشست کے صدر تھے نہایت مضطرب ہو گئے۔ اور سیکرٹری صاحب سے آنکھوں ہی آنکھوں میں شکوہ سنج ہوئے۔ اگرچہ تمام محفل گرمیٔ کلام وارفتہ ہو رہی تھی مگر صدر موصوف کا یہ حال تھا کہ نہ راہ رفتن نہ جائے ماندن۔ سیکرٹری صاحب بھی اسی عالم میں تھے۔ مگر حاضرین کے اشتیاق بے پایاں کی وجہ سے دم بخود رہنے پر مجبور تھے۔

نظم بلاشبہ زوردار اور خالص سیاسی رنگ کی تھی۔ خالق ہر دو عالم سے شکایت کی گئی تھی کہ مجھ پر ہزاروں آفتیں نازل کی جائیں ہزار ہا مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا مگر میں بندہ تسلیم و رضا ہو کر ان مصائب کو جھیلتا۔ مگر یہ مصیبت کہ مجھے ایک غلام ملک میں پیدا کیا۔ مجھ سے نہیں جھیلی جاتی۔ اس نظم کے خاتمے پر حاضرین نے ہل من مزید کے نعرے بلند کیے اور کچھ اور سنائیے پر اصرار شروع کیا۔ مگر جناب صدر نے تدبر سے کام لے کر اپنی رخصتی تقریر شروع کر دی۔ اس تقریر میں اگرچہ شاعر کا نام نہیں لیا گیا۔ مگر اس قسم کی نظم پڑھے جانے پر اظہار ناپسندیدگی ضرور کیا۔ چونکہ گیارہ بج گئے تھے۔ اس لیے صدر موصوف صدارت کی عزت سر محمد یعقوب کو تفویض فرما کر رخصت ہو گئے اور

جناب جوش ملیح آبادی کو کچھ اور سنانے کا موقع نہ مل سکا۔

اس واقعہ کے بعد عرش ملسیانی نے مقصد حیات پر اپنی نظم سنائی۔ یہ نظم بھی کامیاب رہی۔ نظم کا موضوع اگرچہ سیاسی نہ تھا مگر پھر بھی اس میں مردانہ جذبات اور اولوالعزمی پیدا کرنے والے مضامین کی فراوانی تھی۔ اس نظم سے متاثر ہو کر جناب سیکرٹری صاحب نے ان شعراء سے جو عرش ملسیانی کے بعد پڑھنے والے تھے بطور پیش بندی فرداً فرداً یہ درخواست کی کہ آپ نظم کی بجائے کوئی غزل پڑھیے گا۔ اس قسم کی درخواست سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منتظمان جلسہ کو سیاسی نظم پڑھے جانے کا کس قدر خدشہ دامن گیر تھا اور وہ مشاعرہ کو صرف غزل گوئی تک محدود رکھنے کے لیے کس قدر بے قرار تھے۔

اس مقام پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعرائے کرام کو بھی آداب محفل کے خیال سے سیاسی نظم پڑھنے کا موقع محل پرکھ لینا ضروری ہے۔ جب انہیں معلوم ہو کہ جلسہ میں حکام اور سرکاری ملازمین بھی شامل ہیں تو سٹیج کو سیاسی پلیٹ فارم بنانا اور ان ملازمین کو ایسی ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنا جس کے اثر سے انہیں محفل میں بیٹھنا دشوار ہو جائے اور جواب طلبی کا خدشہ بھی لاحق رہے۔ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے۔ یہ مانا کہ حاضرین کی اکثریت اس قسم کی نظم سننے کے لیے بیتاب ہو لیکن اقلیت سے رواداری کا برتاؤ کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ آج کل سیاسی جلسے ہر شہر میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں دھواں دھار تقریریں ہوتی

ہیں۔ ان جلسوں میں کچھ وقت شعراء کے لیے بھی وقف کر دینے کا رواج ہوتا جا رہا ہے سامعین بھی سیاسی مذاق کے ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی سیاسی نظم کے پڑھے جانے کا صحیح محل انہیں جلسوں کو کہا جا سکتا ہے۔ خالص ادبی مشاعروں میں چونکہ غیر سیاسی جماعت کے ارکان بھی اپنے ادبی مذاق کی وجہ سے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس قسم کی صحبت میں نظم پڑھنے کے لیے کوئی اور عنوان منتخب کیا جا سکتا ہے۔ صدہا عنوانات ایسے ہیں جن پر کوئی شاعر اظہار خیالات کر سکتا ہے۔ اور اپنی خوش بیانی کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ اور اگر کسی مقام پر سیاسی خیالات ظاہر کرنے کی ضرورت ہو تو وہاں انداز بیان اس قدر ہلکا اور غیر محسوس ہونا چاہیے کہ کسی پر بار نہ ہو۔ غزلیات میں بیسیوں اشعار ایسے ہوتے ہیں جنہیں زمانہ حال کے سیاسی واقعات سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ غزل یا یہ شعر سیاسی ہے مثلاً۔

ذبح کرتے ہی مجھے قاتل نے دھوئے اپنے ہاتھ
اور خون آلود خنجر غیر کے گھر رکھ دیا

٭ ٭ ٭

جفاکش ہے کہاں تک تو جفائیں دیکھنا یہ ہے
ہمارا امتحاں ہے درحقیقت امتحاں تیرا

٭ ٭

نہ تو نالے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

✱ ✱ ✱

فریب ناخدا تو کھل چکا اب ڈوبتے کیوں ہو
خدا کا نام لو شاید یہ بیڑا پار ہو جائے

✱ ✱ ✱ ✱

جیسا کہ سابقہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے مشاہیر شعراء کی بہت معقول تعداد اس مشاعرہ میں شامل تھی اور غیر طرحی مشاعرہ کی وجہ سے سب نے اپنا چیدہ و منتخب کلام پڑھا مگر افسوس ہے کہ حاضرین کا ذوق سماعت بدذوقی کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ ترنم میں پڑھنے والے بلکہ شعر کو الاپنے والے شعراء کا کلام بہت اشتیاق سے سُنا جاتا تھا اور تحت لفظ پڑھنے والوں کو وہ داد نہیں ملتی تھی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ جن شعراء کی آواز بلند نہ تھی انہیں لاؤڈ سپیکر کے باوجود بہت کم سُنا جاتا تھا۔ بلکہ لبا اوقات شور و غل کی آواز ہال کے ہر گوشے میں گونجتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم آزاد انصاری۔ مولانا قمر بدایونی جناب فدا گلاوٹھی۔ جناب احسن مارہروی اور جناب ساغر دہلوی جیسے کہنہ مشق اور پختہ گو اساتذہ کو ان کی خوش بیانی کی داد شور و غل کی صورت میں ملی۔ صدر مشاعرہ نے حاضرین کو بار بار تنبیہ کیا۔ یہ بھی کہا کہ سیکرٹری صاحب نے الارم کی گھنٹی بھی میز پر نہیں رکھی مگر یہ سب کوشش بے سود رہی۔ جناب ساحر دہلوی اپنا کلام سناتے

ہوئے غالب کا یہ شعر اعادہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

محترمی جناب احسن مارہروی کی آواز اگرچہ زیادہ بلند آہنگ نہیں ہے مگر ایسی پست بھی نہیں کہ صرف چند آدمی سُن سکیں۔ موصوف کو بھی متواتر دو نشستوں میں ہلڑ بازی ہی سے سابقہ پڑا۔ سر سیّد رضا علی صدر مشاعرہ نے حاضرین کو کئی دفعہ خاموش رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا حضرت احسنؔ کے رُتبے کا شاعر پڑھ رہا ہے۔ اور آپ شور نہ کریں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے مگر صدر مشاعرہ کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ان حالات سے بیزار ہو کر حضرت احسنؔ نے ایک رباعی ارشاد فرمائی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

جو واقعات اُوپر لکھے گئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ یہ رباعی سامعین ہی کی بد ذوقی سے متاثر ہو کر پڑھی گئی تھی۔ کسی خاص شاعر کی بجائے اس کا روئے سخن سامعین ہی کی طرف تھا اور واقعات مذکورہ یعنی محفل کے رنگ سے قطع نظر کر کے یہ بات مان لی جائے کہ گانے والے شعراء کی طرف بھی اسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ تو یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ جناب احسنؔ مارہروی کے بہت سے شاگرد اور عزیز بھی اس رباعی کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اس لیے کوئی خاص شاعر اس رباعی کو محض اپنی ذات سے منسوب کر لینے میں کسی طرح

حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ مگر سوء اتفاق کہیے یا انتہائے بدگمانی۔ ساغر نظامی نے محض اس بنا پر کہ وہ جناب احسن سے تقریباً نصف گھنٹہ پہلے (اِن کے بعد دو تین شعراء اسٹیج پر آچکے تھے اور پھر جناب احسن کی باری آئی تھی) اپنے شبابیات کی نغمہ سرائی کر چکے تھے۔ اس رباعی کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔ اور اگلے دن یعنی سب سے آخری نشست میں جب کہ حضرت احسن مارہروی دہلی چھوڑ چکے تھے۔ اور شامل مشاعرہ نہ تھے۔ اس رباعی کے جواب میں ایک رباعی اور ایک نظم پڑھ کر دل کا بخار نکالا اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑ کر تمام مشاہیر اردو کو اس قدر مکدر اور بیزار کر دیا کہ ان کے بعد پڑھنے کے لیے راقم الحروف جناب تمر، جناب نوح ناروی انکار کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس انکار کی وجہ سے آخری نشست آدھ گھنٹہ پہلے یعنی ساڑھے گیارہ بجے ختم کر دی گئی۔ اس رباعی کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ مجھے یاد ہے۔ وہی نقل کیے دیتا ہوں۔ رباعی کا مفہوم اور اس کی زمین ذہن نشین کرنے کے لئے یہی دو مصرعے کافی ہوں گے۔

دوسرا مصرع یہ تھا:۔ پاؤں نہیں تو کوہ پہ چڑھتے کیوں ہو

چوتھا مصرع یہ تھا:۔ نغمہ نہیں آتا ہے تو پڑھتے کیوں ہو

مشاعرہ کی فضا پہلے ہی نغماتی تھی یہ رباعی اس سے اور بھی بھڑکا گئی۔ ساغر صاحب کے قول کے بموجب شاعر کے لیے خنیا گر ہونا بھی لازم ہو گیا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست

جن اصحاب نے ساغر صاحب کو کسی مشاعرے میں سنا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ کس طرح جھوم جھوم کر اپنا کلام سناتے ہیں تو

ان میں اور کلاونت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ شعرا الاپنے کا انداز انہیں کو مبارک رہے۔ مگر انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ شعر فی نفسہ وہ وجدانی کیفیت ہے جو بہ قول امیر خسرو سماع کی محتاج ہے نہ صوت خنیاگر کی۔

کو نہ محتاج سماع و صوت خنیاگر نمود

ایک مغنی شاعر کو اختیار ہے کہ وہ محفل میں بربط و چنگ کو بھی اپنا ہم نوا بنائے اور اگر یہ بھی کافی نہ ہو تو چوڑی دار پاجامہ پہن کر گھنگرو بھی باندھ لے اور ان کی سُریلی آواز کے لیے بھی حاضرین کی نغمہ پسندی سے داد کا طالب ہو۔ مگر اسے کہنے کا حق حاصل نہیں کہ جسے نغمہ نہیں آتا وہ پڑھنے کا مستحق نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سامعین کی یہ بد ذوقی جو فی زمانہ ہر مشاعرہ میں نظر آتی ہے انہیں مغنی شعرا کی غنا پسندی اور تبادے کا نتیجہ ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر اگر جناب احسنؔ نے ایک رباعی میں اس رسوائی اور بد ذوقی کا شکوہ کیا تو ساغرؔ صاحب نے یہ کس طرح فرض کر لیا کہ اس رباعی کی شان نزول ساغرؔ صاحب کی ذات سے مختص ہے۔ اسی پر بس نہیں انہوں نے بے محل وردِ دل آزار رباعی پڑھ کر اس بناء پر کہ جناب احسنؔ نے اپنی رباعی کے تیسرے مصرعے میں جوانانِ سخن کو مخاطب کیا تھا۔ جوانی کی ردیف اور عزت الفت وغیرہ قوافی میں ایک نظم بھی غزل کے انداز میں پڑھی۔ جس میں ہر ایک نوجوان کو پیران کہن سال سے باغی ہو جانے کی تلقین کی اور اس بغاوت پر ہر شعر میں سر افتخار بلند کرنے کا وعظ کیا گیا۔ جا بجا

کبر سنی کی مذمت اور جوانی کی ستائش کی گئی۔ اس نظم کا آخری مصرع
یہ تھا جسے خوب جھوم جھوم کر پڑھا گیا۔

جوانی بغاوت بغاوت جوانی

جناب ساغر صاحب نے جس طرح ایک نظم میں بدکارن کی جگہ فقیرہ
باندھ کر عجیب قسم کے اجتہاد کا ثبوت دیا تھا اس رباعی اور نظم
میں بھی یہ کہنا کہ جنہیں نغمہ نہیں آتا وہ محفل میں پڑھنے کے
مستحق نہیں اور جوانی بغاوت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور بغاوت
بذات خود جوانی ہے اسی اجتہاد کی قبیل سے ہے۔ مگر ہمارے
انوکھے مجتہد پر بھی وہ زمانہ آنے والا ہے جب نہ منہ میں دانت
ہوں گے نہ پیٹ میں آنت اس کے علاوہ انہوں نے جو کچھ سیکھا ہے
وہ انہیں بزرگان کہن سال کے فیضان کا مرہون منت ہے۔ مگر
نہایت افسوس ہے بلکہ ماتم کا مقام ہے کہ جن بزرگان فن کے سامنے
انہیں زانوے تلمذ تہہ کرنا چاہیئے تھا ان کی اہانت جس کا نہ کوئی
موقع محل تھا اور نہ اس دریدہ دہنی کی کوئی حقیقی بنیاد تھی۔ محض
چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق بھری محفل میں روا رکھی گئی اور
اس طرح مشاعرہ کا آخری حصہ جو زیادہ پُر لطف ہوا کرتا ہے
نہایت بے لطف کر دیا۔ جناب ساحر دہلوی نے ساغر صاحب کی برخوداری
و سعادت اطواری پر بار بار طنزیہ شاباش کہی اور ان کے اُستاد
جناب سیماب صاحب سے یہ پوچھا بھی کہ بتاؤ اب بوڑھے رہنا چاہتے
ہو یا جوان بننا پسند کرتے ہو۔ افسوس کہ سیماب صاحب نے اس
معقول سوال کا جواب شکر خند کی صورت میں ٹال دیا۔

ساحر صاحب کا سیماب صاحب سے شکوہ سنج ہونا ہی بے سود نہ تھا۔ سوال کو ہنسی میں ٹال دینے کے سوا ان سے اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے۔ جب انہیں خود اپنے اُستاد بھائیوں کی عزت و آبرو کا کوئی پاس نہیں ہے۔ تو ان کے عزیزوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ خاندان داغؔ کی عظمت و توقیر برقرار رکھنے اور اس کا احترام کرنے میں کوشاں ہوں گے محض خواب و خیال ہے اس لحاظ سے کہ جناب احسنؔ حضرت فصیح الملک کے بہت بڑے خدمت گزار اور ان کے برگزیدہ و نامور تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ساغر صاحب کی یہ روش اور بھی قابل اعتراض بلکہ قابل ملامت ہو جاتی ہے۔ زمانے کی ہوا گو یہی ہے کہ نوجوان اپنے جسمانی والدین کو پر کاہ سمجھ لینے کے بعد اپنے روحانی والدین سے بھی تمرّد اور بغاوت اختیار کر لیں، تو اس طوفان میں ڈوبنے والوں کا خدا حافظ کہنے اور ان کے حق میں دُعائے خیر کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہو سکتا ہے۔

مشاعرہ کی یہ بے لطفی اور سامعین کی بد ذوقی جو گذارش کی گئی چونکہ مغنی شعراء ہی کے وجود سے پیدا ہوئی اور جناب ساغر نے جو گوہر افشانی کی وہ بھی انہیں کے شبابیات سے وابستہ ہے۔ اس لیے: مشاعرہ کے منتظم اصحاب نے مشاعرہ کو کامیاب بنانے اور اپنی ادبی خدمت کا مظاہرہ کرنے میں جو سعی بلیغ فرمائی اس پر ان رنجدہ حالات کے باوجود کسی حرف گیری کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اپنا فرض بہ وجوہ احسن پورا کیا اور اس کے لیے وہ تمام اہلِ ذوق اور تمام ادب اُردو

کی طرف خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ اس تحسین میں جناب آنریری سیکرٹری صاحب یعنی فصیح الدین بی۔اے۔ کے اخلاق محسنہ بھی برابر کے حصے دار ہیں۔ کلام جو اس مشاعرہ میں پڑھا گیا اُس کی نقل تمام شعراء سے طلب کی گئی ہے اور وہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔ اس لئے اس کا اقتباس یہ مجموعہ وصول ہو جانے پر پیش کیا جائے گا۔

بزمِ داغ

آج سے چھ سات سال پہلے بھی حضرت سائل دہلوی کی تحریک پر دہلی میں یوم داغؔ کی تقریب منائی گئی تھی۔ مگر صرف اس حد تک کہ دس گیارہ شاگردان داغؔ مرحوم کو ریڈیو سٹیشن پر اپنا اپنا کلام نشر کرنے کے لیے مدعو کر لیا گیا تھا۔ اس سال دہلی کے ارباب ذوق نے اس تحریک کو مزید وسعت دے کر مقبول عام بنا دینے کی سرگرم کوشش کی اور ۴، ۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو اس تقریب کے سلسلہ میں یادگاری مشاعرہ منعقد کیا۔ ٹاؤن ہال دہلی میں یہ تقریب منائی گئی۔ داخلہ کے پاس صرف خوش مذاق اصحاب کے نام جاری کیے گئے تھے۔ اس تجویز سے یہ فائدہ ہوا کہ حاضرین کا ذوق سماعت شور و غل کرنے والوں کی بدذوقی سے محفوظ رہا۔ شعراء کا کلام نشر کرنے کے لیے ۴ دسمبر کو رات ٹاؤن ہال کی عمارت کا انتظام کیا گیا اور ۵ دسمبر کی دوپہر کو ریڈیو سٹیشن اس کام اور مقصد کے لیے منتخب ہوا۔

اس تقریب کے منتظمین میں سے خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی،

اور کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی المتخلص سحر جوائنٹ وار فرنٹ
صوبہ دہلی کے منتظم اعلےٰ ہیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حق تو
یہ ہے کہ اس تقریب کی کامیابی انہیں دونوں ادب نوازوں کی سرگرم کوششوں
کا نتیجہ ہے۔ دہلی میں خواجہ صاحب کا دم ان کے ادبی مشاغل کی وجہ
سے بڑا غنیمت ہے۔ وہ خود بھی بہترین ادیب اور بلند پایہ افسانہ نگار
ہیں۔ ان کے دولت کدے میں ہر اتوار کو بزم سخن اور محفل ادب
منعقد ہوتی رہتی ہے۔ وہ ان ہفتہ واری جلسوں میں میزبان کے
فرائض ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مختلف ادبی تحریکوں
میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ اپنے حسن اخلاق اور وسیع المشربی
کی وجہ سے بھی وہ شرفائے دہلی کا بہترین نمونہ ہیں۔ حاضرین کی
بہت بڑی تعداد کو خاموش رکھنے اور بڑے بڑے مشاعروں میں
ضبط قائم کرنے میں وہ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ دوسرے کنور مہندر سنگھ
صاحب بیدی اپنے ذوق سخن کی وجہ سے سرکاری فرائض میں
بے حد مصروف رہنے کے باوجود مقامی مشاعروں کی زینت کہے جا
سکتے ہیں۔

اس مشاعرے کے لیے جو حضرت داغ مرحوم کے نام نامی سے
منسوب تھا، حضرت داغ ہی کا ایک مصرع

چمن اُڑ گئے آندھیاں آتے آتے

بطور مصرع طرح مشتہر کیا گیا تھا۔ اس قسم کے مصرع طرح پر
معترض صاحبان کا یہ اعتراض حق بجانب تھا کہ مصرع طرح کے لیے
حضرت داغ کی ایسی غزل کیوں منتخب کی گئی جس پر تضمین نے کسی

اور کے لیے کچھ گنجائش کہنے کی نہیں چھوڑی اور جس میں ردیف کو سنبھالنا نہایت مشکل کام ہے۔ ہر ایک قافیہ جس خوبی سے اور خوش اسلوبی سے انہوں نے بٹھا دیا ہے اس سے بہتر اور کوئی صورت خیال میں نہیں آ سکتی۔ کہاں۔ وہاں۔ ہاں۔ مہرباں۔ شوخیاں۔ آندھیاں۔ ہچکیاں۔ آسماں۔ زباں وغیرہ قوافی اس غزل میں جس طرح لائے گئے ہیں انہیں دیکھ کر کوئی شخص ان قوافی کو چھوتے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے — چمن اڑ گئے آندھیاں آتے آتے

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا — نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

ابھی سن ہی کیا ہے جو بے باکیاں ہوں — انہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو — کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اسی طرح اور قوافی بھی نہایت دلکش اور لاجواب واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً (۱) اجل ہو گئی تو کہاں آتے آتے

(۲) بہت دیر کی مہرباں آتے آتے،

اس کے بعد حضرت داغ مرحوم کی پوری غزل مصرعِ مطروحہ پر براڈکاسٹ کی گئی۔ جناب اختر نگینوی نے اس مشاعرے میں شامل ہونے سے تو بوجہ علالت اظہارِ معذرت لکھ بھیجا تھا مگر طرحی غزل ارسال فرمائی تھی جو خواجہ صاحب نے نشر کر دی۔ جناب بیخود دہلوی اور حضرت سائل دہلوی کی طرحی غزلیں بھی نشر ہوئیں۔ جناب بیخود دہلوی کی غزل ۳۳ شعر کی تھی۔ مگر براڈکاسٹ کا وقت صرف ۹ شعر پڑھنے کی اجازت دیتا تھا اس لیے موصوف نے اس غزل کے ۹ شعر ہی پڑھے۔ ان کی غزل میں بعض نئے قوافی بھی تھے۔

مثلاً کھکیاں ۔ بوندیاں وغیرہ اسی طرح حضرت سائل کی غزل میں ایک نیا قافیہ ہاں بھی بہت خوب تھا۔

نہیں بن گئی لب پہ ہاں آتے آتے

مشاعرے میں شریک ہونے کی زحمت بے جا بھی انہوں نے مقطع میں بیان فرمائی۔

پکڑ لائے سائل کو بزمِ سخن میں

راقم الحروف نے بھی تو دس شعر کی طرحی غزل کہی تھی۔ مگر منتظمین چاہتے تھے کہ اس جلسے میں دو تین قطعات تاریخ وفات بھی پڑھے جائیں اس لیے میں نے اور جناب زار دہلوی نے یہی چیز براڈکاسٹ کی۔ جناب نواب سائل دہلوی نے ایک تعارف نامہ بھی اس مشاعرے کے لیے نظم فرمایا تھا ——— چوں کہ براڈکاسٹ کا وقت ایک شاعر کے لیے صرف پانچ منٹ تھا اس لیے وہ تنگ وقت میں صرف طرحی غزل ہی سنا سکے اور یہ تعارف نامہ پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس مشاعرے کی روداد مکمل کر دینے کے مقصد سے یہ تعارف نامہ اور وہ قطعہ تاریخ وفات جو راقم الحروف نے وہاں نشر کیا یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

حاضرِ شاگرداں داغ اور صرف غزل بھیج دینے والے شاگردان داغ کو اس مشاعرے میں حروف تہجی کے اعتبار سے پیش کیا گیا۔ منتظمین جلسہ کی یہ تجویز بھی بہت مناسب اور بجا تھی۔ طرحی کلام شاگردان داغ ہی تک محدود رہا۔

اس مشاعرے پہ ارباب ذوق کا یہ اعتراض بھی وزن دار

ہے کہ منتظمین بعض نامور شاگردانِ داغ کو زینتِ مشاعرہ بناتے
اور اس تقریب میں شریک بزم کرنے سے قاصر رہے۔ اس کو
سب نے خاص طور پر محسوس کیا۔

حضرت نوح ناروی جناب مبارک عظیم آبادی۔ جناب مبین
جناب دلشیر، جناب طپش۔ جناب اختر نگینوی۔ نواب عزیز وغیرہ
مشاہیر میں سے کوئی صاحب بھی شاملِ تقریب نہ تھے۔ اگرچہ بعض
اصحاب اپنے خاص حالات کی وجہ سے اور بعض اپنی علالت کی
وجہ سے معذور بھی تھے۔ لیکن اصحاب ایسے بھی تھے جنہیں شامل
کرنے کے لیے مزید توجہ اور کوشش کی ضرورت تھی۔ حضرت
بیخود دہلوی کئی سالوں سے باہر کے مشاعروں میں شرکت تو درکنار
مقامی مشاعروں میں بھی شامل نہیں ہوتے۔ وہ گراں گوش اور
رعشہ بدست بھی ہیں۔ اس طرح جناب نواب سائل دہلوی اپنی
بے کار ٹانگ کی وجہ سے چلنے پھرنے اُٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور
ہیں۔ جب ان بزرگوں کو اس مشاعرے میں شامل ہونے کے لیے
رضامند اور آمادہ کر لیا گیا تو دوسرے مشاہیر کو بھی اسی قسم کی
سرگرم کوشش سے شاملِ مشاعرہ کرنا ممکن تھا۔ انہیں نواب سائل
دہلوی کے توسط سے مکرر دعوت نامے ارسال کیے جا سکتے تھے۔
ان کے احترام کے خیال سے بھی دو چار اصحاب ضرور شاملِ مشاعرہ
ہو جاتے۔ شاید تنگیٔ وقت کی وجہ سے اس قسم کی کوشش نہ
کی گئی ہو۔

حضرت سائل پہلے ہی دن تشریف فرما ہو سکے۔ دوسرے

دن حاضر نہ ہو سکے۔ حضرت بیخود دونوں دن مشاعروں میں شریک تھے۔ جناب زارؔ دہلوی بھی ہر دو مشاعروں میں شامل تھے۔ مشاعرہ کے آغاز میں سر سید سلطان احمد بالقابہ صدر مشاعرہ نے حضرت داغؔ کے حالات زندگی اور ان کی شاعرانہ عظمت پہ ایک جامع مضمون جو وہ لکھ کر لائے تھے پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون اس مشاعرہ اور اس تقریب کے متعلق بہت جامع اور مناسب حال اور ہر پہلو سے مکمل کہا جا سکتا ہے۔ اور کسی صاحب نے اس قسم کے مصرع طرح پر جس کی مشکلات اور یہ بیان کی گئیں۔ غزل کہنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ کلام سناتے وقت شاگردان داغؔ کے فوٹو بھی علیحدہ علیحدہ لیے گئے۔ اور سنہری ہار بھی گلے میں ڈالے گئے۔ داد بہت فراخدلی سے ملتی رہی۔ ان کے بعد دوسرے شعرا نے اپنے غیر طرحی کلام سے حاضرین کو بہت محظوظ کیا۔ الغرض پہلے دن کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔

۵ دسمبر کو دوپہر کے وقت ریڈیو سٹیشن پر بھی براڈکاسٹ ہوا۔ اس میں بھی دس بارہ شعراء نے شرکت فرمائی۔ اس محدود نشست کے صدر کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی تھے۔ مقامی شعراء کے علاوہ نوجوان طبقہ کے خوش گو شعراء باہر سے بھی تشریف لائے تھے۔ مثلاً صابرؔ صاحب شری۔ بھوپال۔ شکیلؔ بدایونی۔ عرشؔ ملسیانی۔ خمارؔ بارہ بنکی۔ تخشبؔ میرٹھی وغیرہ۔ بہت سے اصحاب کے اسمائے گرامی مجھے یاد نہیں رہے۔ اس تاریخ کی رات کے مشاعرے میں حضرت بیخودؔ دہلوی نے چونکہ اعلان فرما دیا تھا کہ اب میں کسی اور مشاعرے میں کبھی

شامل نہیں ہوں گا اور نہ شامل ہونے کے قابل رہا ہوں۔ اس لیے حاضرین نے ان سے تین چار غزلیں سنانے کی فرمائش کی۔ یہ فرمائش انہوں نے منظور فرمائی اور انہیں ایک ایک گھنٹہ کے بعد ایک ایک غزل سنانی پڑی الغرض دونوں تاریخوں کے یہ مشاعرے خوبیٔ کلام اور حسنِ انتظام کی وجہ سے قابلِ ستائش تھے اور اس لحاظ سے کچھ مشاہیر اور مرحوم بزرگوں کی یادگار منانے کے جذبے سے منسوب تھے۔ انہیں اور بھی قابلِ تحسین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منتظمین جلسہ بھی اپنی مساعیٔ جمیلہ کے لیے دُنیائے ادب کی طرف سے سپاس گذاری کے مستحق ہیں۔

تعارف نامہ

(از نتیجہ افکارِ بلیغ جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی)

سائلؔ ہے میرا عرف علم ہے گدائے داغؔ
گلچیں باغِ داغؔ ہوں زلّہ ربائے داغؔ

اسلافِ عام دوست کا دھندلا سا ہوں نشاں
ارشدؔ سے بھی ہے فن میں تلمذ سوائے داغؔ

غالبؔ کا بھی نبیرہ ہوں ثاقبؔ کا نورِ عین
مشہور ہوں میں بلبلِ شیریں نوائے داغؔ

پیرو سخن میں بلبلِ ہندوستاں کا ہوں
دل سے پسند ہے مجھے طرز و ادائے داغؔ

سیمابؔ و نوحؔ و اخترؔ و بیخودؔ متینؔ و جوشؔ
یہ ہستیاں ہیں ایسی ہے جن سے بقائے داغؔ

نیرؔ و زارؔ و سوزؔ و المؔ سیدؔ و مزاجؔ
ان کے دل و زباں سے ثابت وفائے داغؔ

شیریں سخن [illegible] سب سے ہیں
لاتعداد آئی جائے گی کو انہیں خاکِ پائے داغؔ

ہم مرتبہ بن ان کا نہیں ہو سکتا ہے کوئی ضرور — ایک ایک زمزم ہیں ہیں میرے یہ بجائے داغؔ
ان کے سوائے ان کے تلامیذ دور دور میں — ہیں خوشہ چین، گلشن فرحت فزائے داغؔ
پیوند خاک ہو گئے جو اس کے خوشہ چیں — ہے ان کا سوز داغ ابھی دل میں سوائے داغؔ

یہ داغ ڈے بہ لفظ دگر ہے ادب کی بزم
شائق ہے نغمہ سنجیوں میں نالہ سرائے داغؔ

قطعہ تاریخ وفات

فصیح الملک جہاں استاد حضرت داغؔ دہلوی۔

(از جوش ملسیانی مدیر رہنمائے تعلیم لاہور)

جو یوم داغؔ کی تقریب پر مشاعرہ دہلی میں ۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کو
براڈ کاسٹ کیا گیا۔

حیف وہ معجز رقم معجز بیاں بھی اٹھ گیا
چار جانب سے سنی جس نے صدائے آفریں

آشیاں میں اب نہیں وہ عندلیب خوش نوا
جس کا ہر نغمہ تھا دلکش ہر ترانہ دل نشیں

پایۂ حسن سخن جس کا تھا ہم دوش فلک
آج ہے وہ آسمان شاعری زیر زمیں

اس کے نغموں سے بھی نالوں کی صدا آتی ہے آج
جس کے نالوں پر بھی تھا نغمات شیریں کا یقیں

لاکھ ڈھونڈے اس کو گلزارِ سخن میں کوئی
داغ کا رنگِ تغزل مل نہیں سکتا کہیں

رفعتِ مضمون سے معراجِ سخن تھی ہر غزل
ہر غزل میں قافیہ تھا قاف کا پہلو نشیں

رنجشوں کے ذکر میں بھی سوشکر گفتاریاں
تلخیِ غم کے مضامیں بھی سراسر انگبیں

پر بیاں میں جدّتیں تھیں جدّتوں میں شوخیاں
شوخیاں بھی وہ کہ جھک جائے متانت کی جبیں

بزم میں بے سود ہے اب اوّل و آخر کی بحث
دورِ آخر میں وہی تھا افتخارِ اوّلیں

محفلِ غم میں سنادو جوش یہ سالِ رحیل
بلبلِ ہندوستاں آج اپنے گلشن میں نہیں

۱۳۲۲ ہجری

سہارنپور کا مشاعرہ

پچھلے سال بھی سہارنپور بہت شاندار اور یادگار حیثیت کا تھا۔ اس دفعہ اس شہر میں بہت بڑی نمائش بھی تھی۔ اور اس نمائش کے سلسلے میں یہ مشاعرہ منعقد کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا۔ یہ نمائش پہلے بھی یہاں ہر سال دھوم دھام سے ہوتی رہی ہے۔ مگر جنگی حالات کی وجہ سے پچھلے چھ سات سالوں میں ملتوی رہی تھی۔ جس شان و عظمت کی یہ نمائش تھی اسی شان و عظمت کا یہ مشاعرہ بھی تھا جو مورخہ ۲، ۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کو نمائش کے ہی وسیع میدان میں منعقد ہوا۔ مقام مشاعرہ اور میدان نمائش کی آرائش و زیبائش اس قدر بصارت نواز اور دل آویز تھی کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ جناب سید نثار حیدر صاحب زیدی ڈپٹی کلکٹر سہارنپور اپنی ادب پروری ہی کے خراج تحسین کے مستحق نہیں ہیں۔ بلکہ آرائش و زیبائش کے لیے بھی ان کی نفاست پسندی اور ذوق طبیعت قابل ستائش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقام مشاعرہ کی زیبائش اور دلکشی جو یہاں دیکھی گئی شاید اور کسی جگہ دیکھنے میں آئے گی۔ کسی شاہی دربار کی آرائش آپ تصور میں لائیں تو شاید اس پر تکلف آرائش کا خاکہ ذہن میں آسکے۔ مہمان شعرا کی خاطر و مدارت اور قیام گاہ

کا انتظام بھی بحیثیت مجموعی قابل اطمینان تھا۔

نشست فرشی یعنی بالکل مشرقی طرز کی تھی۔ کرسی میز کا انتظام صدر مشاعرہ کے لیے بھی نہیں تھا۔ غالیچے اور گاؤ تکیے ہی سٹیج کی زینت ہو رہے تھے۔ مہمان شعراء میں جناب اثر لکھنوی۔ حضرت نوح ناروی۔ جناب سیماب اکبرآبادی۔ جناب جگر مرادآبادی۔ عرش ملسیانی۔ شکیل بدایونی۔ محشر جارچوی۔ شیدا قابل گلاؤٹھی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مقامی شعراء میں سے بھی متعدد اصحاب نے داد سخن حاصل کی۔ ان میں جناب احمد اور جناب عباس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ہر دو شعراء ایک ہی خاندان کے رکن ہیں اور جناب غریب مرحوم سہارنپوری کے شاگرد ان رشید ہیں۔

پہلے روز کی نشست جو ۹ بجے شب کو شروع ہو کر چار بجے تک جاری رہی طرحی تھی۔ مصرع طرح یہ تھا۔

تنگ آ گئے ہیں اس دلِ دردآشنا سے ہم

یہ مصرع جب مشتہر کیا گیا تھا تو مشاعرہ کی تاریخیں یکم اور ۲ دسمبر اعلان کی گئی تھیں مگر یکم دسمبر کو ہارڈنگ لائبریری دہلی کا مشاعرہ بھی تھا اس مشاعرہ کے براڈکاسٹ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس لیے بہت سے شعراء نے یکم دسمبر کے لیے سہارنپور کے مشاعرہ میں شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ راقم الحروف بھی انہیں عذرخواہوں میں شامل تھا اور صرف ۲ دسمبر نے مشاعرہ میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی تھی۔ چونکہ کچھ معذوری متعدد اصحاب کی طرف سے تھی اس لیے جناب زیدی صاحب نے مشاعرہ کی تاریخیں تبدیل کر کے

۲، ۳ دسمبر مقرر فرما دیں۔ اس تبدیلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام مدعو شعراء
مطمئن ہو گئے اور دونوں شاعروں شامل ہونے کے قابل ہو سکے۔ جناب
دل شاہجہاں پوری اور حضرت صفی لکھنوی اس سال اپنی معذوریوں کی وجہ
سے شامل نہیں ہو سکے۔ ہر دو مشاہیر کی عدم شرکت خاص طور پر
محسوس کی گئی۔ زیدی صاحب نے اس دفعہ کسی مزاحیہ نگار شاعر کو
دعوت شرکت نہ دی تھی۔ اس کمی کے باوجود پہلی نشست ہر لحاظ سے
قابل ستائش تھی۔ داد دینے والے اصحاب پوری سرگرمی اور فراخدلی
سے داد دیتے رہے اور مشاعرہ اوّل سے آخر تک خوب گرم رہا۔ کلام
جو پڑھا گیا وہ ہر طرح قابل قدر اور قابل داد تھا۔
یہ بے قاعدگی اس نشست میں ضرور بار خاطر رہی کہ جو اصحاب
طرحی غزل کہہ کر نہیں لائے تھے ان سے غیر طرحی کلام بھی بیچ بیچ میں
پڑھوایا جا رہا تھا۔ آج کل نوجوان شعراء کے لیے طرح کی پابندی
بار خاطر ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شعراء کی طرحی غزلیں
بہت مختصر ہونے کے علاوہ معمولی حیثیت کی تھیں۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ اشعار بے دلی سے کہے ہیں۔ اور چھ سات
شعر کہہ کر دفع الوقتی کر دی ہے۔ اس کے باوجود متعدد طرحی غزلیات
بہت زوردار اور اپنے رنگ میں فرد تھیں۔

دوسرے دن کی نشست دس بجے رات کو شروع ہو سکی۔ اس
تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے شعراء کو نمائش کی طرف سے دعوت
طعام (ڈنر) دی گئی تھی۔ اور دعوت کے منتظمین اپنے فرائض کو
دس بجے کے قریب تک بہ مشکل ختم کر سکے۔ اس نشست میں جو

غیر طرحی تھی سب سے پہلے ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا۔ اس قسم کا مشاعرہ پچھلے سال بھی بہت کامیاب رہا تھا۔ اس میں قلعہ دہلی کے آخری مشاعرے کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ اس دفعہ یہ تمثیلی مشاعرہ شعرائے لکھنو کے لئے مخصوص رکھا گیا۔ نواب آصف الدولہ کا دربار اس میں سودا۔ میر خواجہ میر درد۔ میر سوز ناسخ آتش مصحفی جرأت۔ انشاء شیخ علی حزیں خواجہ وزیر پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مصنوعی صورتیں حسب مراتب پیش کی گئیں۔ اس وقت سٹیج تھیٹر کا نمونہ بن گئی تھی۔ مختلف شعراء اسی زمانے کے لباس اور اسی زمانے کے وضع میں یکے بعد دیگرے تشریف لا رہے تھے۔ جان صاحب (مشہور ریختی گو) کو زنانہ لباس میں لایا گیا تھا۔ غالب اور انیس بھی اپنی نوجوانی کے عالم میں شریک صحبت ہوئے۔ کلام بھی ان مصنوعی شعرا نے وہی پڑھا جو اس زمانے کی شاعری میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً میر تقی میر نے وہ قطعہ سنایا جو انہوں نے اہل لکھنؤ کو مخاطب کر کے کہا تھا اور جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

اس طرح جرأت نے (جو نابینا بنے ہوئے تھے) جو غزل پڑھی اس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں

یہ غزل پڑھ کر انہوں نے میر تقی میر سے مؤدبانہ طور پر اظہار رائے طلب کی مصنوعی میر تقی میر نے جواب میں کہا کہ میاں تمہیں شعر کہنا تو نہیں آئے گا چوما چاٹی کر لیا کرو۔ انیس نے جو

اشعار پڑھے وہ ان کی مشہور زمین کے ہیں۔

ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

نسیم نے اپنی تصنیف گلزار نسیم میں سے وہ اشعار پڑھ کر سنائے جو ان کی مثنوی میں بڑے معرکے کے ہیں۔ مثلاً

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

بعض اشعار کے ساتھ جو ادبی واقعات وابستہ ہیں انہیں بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ ناسخ اور آتش میں نوک جھونک بھی ہو رہی تھی۔ سید انشا نہایت میلے اور بوسیدہ لباس میں غریب دیہاتیوں کا سا حقہ ہاتھ میں لیے ہوئے آئے۔ کسی نے ان کو نہیں پہچانا۔ اس مشہور اور عبرتناک واقعہ کو بھی اچھی طرح پیش کیا گیا۔ انہوں نے اپنی چلم کے لیے ایک شاعر سے آگ بھی مانگی۔ غزل بھی وہی پڑھی جو فی الواقع تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں

یہ غزل پڑھ کر وہ اس صحبت سے باہر چلے گئے اور چند منٹ سناٹے کا عالم رہا۔ غرض یہ عبرتناک منظر بہت اچھی طرح دکھایا گیا۔ دو گھنٹے یہ تمثیلی مشاعرہ جاری رہا۔ جسے ہر لحاظ سے قابل تعریف اور بہت کامیاب کہنا چاہیے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ آصف الدولہ کے وزیر (جو دراصل مقامی اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے) داد دینے میں اتنے سرگرم اور سراپا داد تھے کہ ان کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان کی یہ سرگرمی اور نکتہ پروری اور خاص شعر کا کے اشارات

اس مشاعرے کو بہت دلکش اور قابل دید ثابت کر رہے تھے۔ حق یہ ہے کہ وہ اس تھیٹر کے ایک بہت کامیاب ایکٹر تھے۔ اور اس تمثیلی مشاعرہ کی اتنی کامیابی میں ان کی نکتہ پروری نے بہت کچھ اعانت کی۔ اگرچہ تمام مصنوعی شعراء اچھے شعر کی داد سے غافل نہ تھے۔ مگر جو گرمی صحبت ان کی وارفتگی اور ہر اچھے شعر پر ان کی ہنگامہ آرائی سے پیدا ہو رہی تھی، وہ اس صحبت کو بہت چمکا گئی۔ شمع کی گردش مائیکروفون کی گردش بھی وزیر صاحب ہی کے فرائض میں داخل تھی۔ یہ فرض ان کے ذمے کچھ نامناسب سا معلوم ہوتا تھا۔

بارہ بجے یہ ڈرامہ ختم ہوا اس کے بعد اس لکھنوی مجمع شعراء کا فوٹو لینے کی کوشش کی گئی مگر اس کے لیے بہت زیادہ روشنی کی ضرورت تھی جو وقت پر مہیا نہ ہو سکی۔ اس لیے یہ کام دوسرے دن کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد غیرطرحی مشاعرہ شروع ہوا۔ مگر اس میں وہ گرمی جو پہلے دن کی نشست میں نظر آتی تھی بالکل نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پہلے دن کا مشاعرہ چار بجے رات کو ختم ہوا۔ دوسری وجہ یہ کہ بہت سے اہل ذوق بے خوابی کی وجہ سے آج تشریف نہ لائے تھے۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نمائش کے کھلے میدان میں سردی بہت زیادہ تھی۔ اور ہر وقت کے چھڑکاؤ نے جو میلے میں گرد و غبار کی وجہ سے ضروری تھا۔ اس سردی کو بھی شدید کر دیا تھا۔ آدھی رات گذر چکی تھی اس وقت جناب اثر لکھنوی کی زیر صدارت یہ غیرطرحی مشاعرہ شروع ہوا۔ آنریبل

سرِ خاطر کی صدارت ہوتی تو شاید وہ اپنی بذلہ سنجی اور مزاحیہ طبیعت سے محفل کو شگفتہ کر دیتے مگر صدارت تھی جناب اثر کی ۔ ان کی طبیعت بہت ہی خاموش پسند واقع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ حاضرین میں شعر سے بے تاب ہو جانے والوں کی تعداد آج نسبتاً بہت کم تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء پڑھتے ہیں اور کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ یہ رنگ دیکھ کر جناب زیدی صاحب کو ایک جدت سوجھی۔ انہوں نے ایک مقامی کہن سال شاعر کو جو داد حاصل کرنے میں بہت بدنام ہیں۔ سٹیج پر بلایا۔ انہیں مصنوعی داد دینے والے بھی چند مخصوص آدمی ہیں۔ وہ بھی ان کے سامنے آ بیٹھے۔ اب یہ عالم ہے کہ شاعر شعر پڑھتا ہے اور یہ مصنوعی داد دینے والے اپنے شاعر کی ٹھوڑی اور داڑھی تک پہنچا اور واہ واہ سبحان اللہ ماشاء اللہ بلند آواز سے کہہ رہے ہیں۔ شاعر ان کے ہاتھوں کو بار بار دور ہٹا رہا ہے۔ داد دینے والوں کے شور بے ہنگام سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مشاعرہ ایک تماشا بن کر رہ گیا۔ جب تک یہ صاحب پڑھتے رہے محفل خوب گرم رہی۔ کشت زعفران کا عالم تھا مگر ان کے بعد پھر بے کیف ہو گئی۔ اگرچہ اتنی نہیں جتنی اس سے پہلے تھی جناب نوح ناروی سے دو تین چیزیں سنی گئیں۔ آخر ساڑھے تین بجے یہ نشست بھی ختم ہوئی۔ جگر صاحب دوسری نشست میں شامل نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بریلی کے مشاعرے میں بھی شامل ہونا تھا۔

اگرچہ دوسری نشست کی دلکشی اگر پہلی سے زیادہ

تمثیلی مشاعرے کے اختتام تک محدود رہی مگر اس میں شک نہیں کہ جو غیر طرحی کلام اس میں پڑھا گیا وہ بہت قابل قدر اور بلند پایہ تھا۔ حضرت نوح ناروی کی غزل بحر متقارب شانزدہ رکنی میں بہت لاجواب تھی۔ اس میں سکھی سہیلی نئی نویلی البیلی پہیلی وغیرہ قوافی اپنی اپنی جگہ بہت دل آویز اور قابل داد تھے۔ طرحی غزلیات میں سے خدا کے قوافی راقم الحروف نے سماعت کے وقت لکھ لیے تھے۔ روداد مشاعرہ کی کسی قدر تکمیل کے خیال سے وہ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ تاکہ ناظرین لطف سخن سے محروم نہ رہیں۔

محتشم سہارنپوری۔

رخ سوئے کعبہ اور ہے دل سوئے میکدہ
کرتے ہیں بندگی میں بھی دھوکا خدا سے ہم

اقبال سہارنپوری۔

کچھ اس طرح جدا ہیں غم ماسوا سے ہم
گویا خدا سے ہیں متمنی خدا سے ہم

احمد سہارنپوری۔

پیدا کریں گے حسن دل عشق زا سے ہم
بندہ کسی کا بن کے ملیں گے خدا سے ہم

گذرے کسی کے شکوۂ جور و جفا سے ہم
محشر میں گھر کی بات کہیں کیا خدا سے ہم

ارمان مظفرنگری۔

مجبور ایسے ہو گئے ان کی جفا سے ہم
اک دن کریں گے اس کا شکوہ خدا سے ہم

عرش ملسیانی۔

خوئے وفا ملی دل درد آشنا ملا
کیا رہ گیا ہے اور جو مانگیں خدا سے ہم

اتنی خوشی ہوئی ہے ترے التفات کی
جوش ملسیانی۔ عمر گذشتہ مانگ رہے ہیں خدا سے ہم

وہ دن گئے کچھ بھی تھا غیرت کو نا قبول
اثر لکھنوی۔ اب تجھ کو مانگتے ہیں دعائیں خدا سے ہم

کیسے ہیں تنگ ہیں دل دیرآشنا سے ہم
سیماب اکبرآبادی۔ اس کا گلہ بتوں سے کریں یا خدا سے ہم

ظلم وستم کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں
نوح ناروی۔ روز جزا کریں گے نہ شکوہ خدا سے ہم

پورا کرے گا اور کوئی یہ سوال کیا
مانگیں اگر بتوں کو تو مانگیں خدا سے ہم

الغرض یہ مشاعرہ جناب سید نثار حیدر زیدی کے حسن اہتمام اور خوبی انتظام سے بہ ہیت مجموعی کامیاب رہا اور قابل ستائش رہا۔ پہلی نشست اگر ایک بجے یا ڈیڑھ بجے رات کے قریب ختم ہو جاتی تو یقین ہے کہ دوسری دن کی نشست کا آخری حصہ بھی پہلی نشست کی طرح بہت شگفتہ اور کیف آفریں ثابت ہوتا۔ چونکہ نمائش اب حسب دستور سابق ہر سال ہوا کرے گی اس لیے یقین ہے کہ اس کے ساتھ مشاعرہ بھی ہر سال اسی اہتمام اور شان و شوکت سے ہوتا رہے گا۔ شرط یہ ہے کہ جناب زیدی صاحب جن کا ذوق طبیعت اس ادبی اجتماع کا محرک ہے بوجہ ملازمت کسی اور جگہ تبدیل نہ ہو جائیں۔

امرتسر کا آل انڈیا مشاعرہ

یہ مشاعرہ ۲۳ جنوری سنہ ۴۳ء کو سرکاری حکام کے زیر اہتمام ہال دروازہ کے باہر نیو پرل تھیٹر کی عمارت میں منعقد ہوا تھا۔ مسٹر نون ڈپٹی کمشنر، چوہدری روشن لال صاحب اے ڈی۔ ایم جناب ریاض قریشی سٹی مجسٹریٹ، سردار ودے سنگھ صاحب سرکاری وکیل اس کی انتظامیہ کمیٹی کے اراکین تھے۔ ان چاروں اصحاب کو ہندو مسلم سکھ عیسائی کا خوشگوار اجتماع اور اتحاد کہنا چاہیئے۔ اس شاندار بزم سخن کی کامیابی کا سہرا انہیں چاروں اصحاب ادب نواز کے سر ہے۔ جنہیں زمانہ جنگ کے حد سے بڑھے ہوئے کام کے باوجود اس عظیم الشان مشاعرہ کے اہتمام میں منہمک ہونا پڑا۔ یہ انہیں اصحاب کا ادبی ذوق تھا جس نے چار عنصروں کی کیمیائی ترکیب سے اس بزم سخن کے وجود میں نہ صرف زندگی پیدا کی بلکہ اسے زندگی بخش بنا دیا۔

سرکاری حکام اور مشاعرہ کا اہتمام بظاہر دو متضاد سی باتیں ہیں۔ مگر مشاعرے کا مقصد چونکہ ان زخمیوں کی امداد تھا اس لیے اس کار خیر کی تکمیل ان اصحاب کی سرگرم کوشش

اور توجہ کے بغیر اور کسی غیر سرکاری جماعت سے ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ سامعین کے لیے ٹکٹ دو روپے سے پانچسو روپے تک مشتہر کیا گیا تھا۔ سنا گیا ہے کہ اس طرح تیس ہزار سے بھی زیادہ رقم زخمیوں کی امداد کے لیے وصول ہو گئی۔ ایک مشاعرہ کے ذریعے اتنی کثیر رقم کا فراہم ہو جانا ہندوستان میں بالکل نئی بات تھی اور جب معلوم ہو جائے کہ اس بزم کی دونوں نشستوں میں کسی شاعر نے ابھی جنگ یا زخمیوں کی امداد کے لیے کوئی نظم نہیں پڑھی تو مقصد مشاعرہ کے لحاظ سے اس کی کامیابی اور اس رقم کی فراہمی کے لیے سرکاری حکام کی شخصیت اور ان کے ذاتی رسوخ کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آ سکتی۔

حاضرین کی کثرت اور اتنی گراں قدر رقم کی فراہمی کے علاوہ اس مشاعرے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ صدارت کے فرائض پنجاب کے نامور ادیب اور مشہور ادب پرور جناب سر عبدالقادر صاحب بالقابہ کے سپرد رہے۔ اگرچہ ایک نشست کی صدارت کے لیے جناب سر سپرو بالقابہ کا نام بھی تجویز کیا گیا تھا۔ مگر وہ کسی خاص وجہ سے اتنی دور کا سفر گوارا نہ کر سکے۔ اس لیے دونوں نشستوں کے لیے ایک ہی صدر کو تکلیف دی گئی۔ جس مشاعرہ کی صدارت ایسے برگزیدہ سخن شناس کے ہاتھ میں ہو اس کی کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ نشست کا انتظام زیادہ تر مشرقی طرز کا تھا۔ اعلان مشاعرہ میں بھی اس خصوصیت پہ زور

دیا گیا تھا اور تجویز یہ تھی کہ قلعہ معلی کے آخری دور کے مشاعروں کی
طرح یہ مشاعرہ منعقد ہوگا تمام شعرا اور حاضرین مشرقی لباس یعنی
دستار اور اچکن پہن کر آئیں گے۔ نشست فرشی ہوگی۔ قالین
بچھائے جائیں گے۔ اور سامان آرائش بھی زیادہ تر قدیمی وضع کا
ہوگا۔ مگر سامعین کی کثرت کی وجہ سے اس تجویز کے بعض حصے
ناقابل عمل ثابت ہوئے۔ لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی ضرورت محسوس
ہوئی۔ سامعین نے یہ تقاضا کیا کہ شعرا صاحبان کھڑے ہو کر
اپنا کلام سنائیں ان حالات میں شمع بھی گردش نہ کر سکی اور شعراء
بھی بیٹھ کر اپنا کلام نہ سنا سکے اس کے علاوہ مشرقی لباس کی پابندی
بھی آج کل کے زمانہ آزادی میں دشوار ثابت ہوئی۔ انتظامیہ کمیٹی
کے اراکین اور جناب صدر مشاعرہ نے اس پابندی کو بوجود احسن
نباہا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر صاحب بھی اچکن اور شلوار پہن کر آئے۔
ان کی تقلید میں دو اور انگریز صاحبان بھی اسی قسم کے لباس
میں ملبوس ہو کر جلوہ افروز ہوئے مگر حاضرین میں اس تجویز پر
عمل کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہی تھی اور تو اور خود شعرا
صاحبان میں بہت سے حضرات اس تجویز کے پابند نہیں دیکھے گئے۔

شمع اور لباس کو نظرانداز کر دیا جائے تو باقی بہت سی
باتوں میں یہ مشاعرہ مشرقی طرز کا ہی کہنا چاہیئے۔ قالینوں کا فرش
سٹیج پر بچھایا گیا۔ سٹیج پر بیٹھنے والے شعراء اور معززین
ایک خاص جگہ جوتے اور تابوت اتار کر سٹیج پر تشریف فرما ہوتے
تھے۔ [illegible] کرسی اور میز کا نشان تک

موجود نہ تھا۔ صدر صاحب بھی قالین پر تشریف فرما تھے۔ جب کسی شعر کی زیادہ داد ملتی تھی تو شاعر پہ پیسے بھی برسائے جاتے تھے۔ مہمانوں کے لیے پان اور سگریٹ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سامان آرائش بھی قدیمی وضع کا تھا۔ دیواروں پر کشیدہ کی ہوئی پرانی وضع کی پھلکاریاں جن پر مختلف رنگوں کے پھول کاڑھے ہوئے تھے، مصنوعی گلشن کی بہار دکھا رہی تھیں۔

چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ نامور مشاہیر اور پختہ گو شعراء کی بہت معقول تعداد اس مشاعرہ میں رونق افروز تھی۔ پنجاب میں اتنا بڑا ادبی اجتماع بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی۔ قدیر لکھنوی۔ ساغر نظامی۔ حفیظ جالندھری۔ انور جونپوری۔ احسان دانش۔ تاجور نجیب آبادی۔ تاثیر صاحب۔ شکیل بدایونی شمس امرت سری۔ نفیس خلیلی۔ عرش ملسیانی۔ یہ سب اصحاب اس یادگاری مشاعرہ کی زینت تھے۔ ان کے علاوہ مزاحیہ انداز میں کہنے والوں میں دو شاعر ماچس لکھنوی اور آغا حسین کاشمیری بھی قابل ذکر ہیں۔ ان اصحاب نے بھی اپنی شگفتہ بیانی سے حاضرین کو بہت محظوظ کیا۔ منتظمین نے جناب بیخود اور جناب کیفی دہلوی کو بھی شامل مشاعرہ کرنے کی کوشش کی۔ ان بزرگوں نے شرکت کا وعدہ بھی کر لیا تھا مگر وقتی حالات کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔

شعراء پر مصرع طرح یا کسی خاص مضمون کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر شخص نے اپنا منتخب کلام اور بہترین کلام سنا کر حاضرین کو خوش وقت فرمایا۔ چار گھنٹے دن کی نشست اور پانچ گھنٹے رات کی

نشست کے لیے صرف ہوئے۔ سامعین نے بھی مبتدی اور منتہی سب کا کلام عام طور پر بڑے صبر و سکوت اور اشتیاق سے سنا۔

۲۴ جنوری سنہ ۴۳ کو دوپہر کے وقت مہمان شعراء کا فوٹو بھی لیا گیا اور تمام شعراء کو بڑے اصرار سے مجبور کیا گیا کہ وہ اس تقریب کے ختم ہونے تک واپسی سفر ملتوی کر دیں۔ راقم الحروف کا یہ معقول عذر بھی کسی نے نہ سنا کہ میری عمر اب تصویریں کھنچوانے کی نہیں ہے۔

اس تقریب سے فراغت ابھی ملی ہی تھی کہ رائے صاحب پرکاش چندر رئیس اعظم و صدر بلدیہ امرتسر نے ٹی پارٹی کے لیے اصرار فرمایا۔ یہ تقریب پانچ بجے شام شروع ہو کر ۹ بجے تک رہی۔ منتخب شعراء نے یہاں بھی خوش بیانی کی داد لے کر گرمی کلام سے بزم کو خوب گرمایا اور میزبان نے بھی چائے اور مٹھائی کی قیمت نقد سخن کے رائج الوقت سکوں کی صورت میں وصول کی۔

٭ ٭ ٭

دہلی میں بزمِ اُردو شملہ کا سالانہ مشاعرہ

چونکہ اخراجات کی کفایت کے خیال سے مرکزی حکومت کے بہت سے دفاتر اب موسم گرما میں بھی شملہ نہیں بھیجے جاتے اور بزمِ اُردو شملہ کی ہستی زیادہ تر ان دفاتر ہی کے سرکاری ملازمین کی ادب نوازی پر مبنی ہے۔ اس لیے پچھلے دو سالوں میں اس بزم کا سالانہ مشاعرہ شملہ میں محض مقامی حیثیت کا ہوا۔ ارکان بزم نے اس فروگذاشت کو جو فی الواقع ناگزیر تھی خاص طور سے محسوس کیا۔ اور اس کی تلافی کے لیے اس سال دہلی میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کرنے کی تجویز طے کی۔ ماہ اگست ہی سے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد شروع کی گئی۔ اور مختلف مشاہیر کو شامل مشاعرہ کرنے کے مقصد سے اراکین بزم نے خط و کتابت کے ساتھ ذاتی رسوخ بھی استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵-۱۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو یہ مشاعرہ ٹاؤن ہال دہلی میں اسی شان سے منعقد ہوا جو شملہ میں بزم اُردو مذکور کا طرہ امتیاز رہی ہے۔ اور جس کی دلکشی تمام مشاہیر شعراء کو معلوم ہے۔

پہلے دن کی نشست طرحی کلام کے لئے اور دوسرے دن کی

غیر طرحی کلام کے مخصوص تھی۔ مرکزی حکومت کے لاء ممبر جناب سر سلطان احمد صاحب بالترتیب دونوں نشستوں کے صدر تھے۔ حاضری پر ٹکٹ لگائے جانے کے باوجود سامعین کی تعداد چھ سو کے قریب تھی۔ ٹاؤن ہال دہلی میں اس سے زیادہ آدمیوں کی گنجائش بھی نہیں۔ مشاہیر شعراء کے اردو میں سے نواب سائل دہلوی۔ پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی۔ جناب ثاقب لکھنوی۔ مولانا حسرت موہانی۔ سیماب اکبرآبادی۔ جناب احسان دانش۔ حفیظ جالندھری۔ جناب محروم۔ جناب روشن صدیقی۔ میر غلام بھیک صاحب نیرنگ انبالوی۔ عرش ملسیانی۔ احمق پھپھوندوی شامل مشاعرہ تھے۔ اتنے مشاہیر کو دہلی میں جمع کر لینے کی سرگرمی کارکنان بزم کے لیے تحسین و آفرین کی مستحق ہے۔ راقم الحروف کو جناب نیرنگ اور محروم سے پہلی دفعہ ملاقات کا موقع ملنے کی وجہ سے بہت مسرت ہوئی۔

پہلے دن یہ مشاعرہ رات کے آٹھ بجے سے ساڑھے دس بجے تک جاری رہا۔ یہ نشست اگرچہ طرحی کلام کیلئے مخصوص تھی مگر راقم الحروف اور جناب حفیظ جالندھری کے سوا اور کسی نے طرحی غزل نہیں پڑھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شعراء آج کل طرحی مشاعروں کے مخالف ہیں۔ اور غیر طرحی مشاعروں کو پسند فرماتے ہیں۔ تمام حاضرین تک شاعر کی آواز لاؤڈ سپیکر کے ذریعے پہنچائی جا رہی تھی۔ اس نشست میں تقریباً تمام شعراء کا کلام صبر اور خاموشی سے سنایا گیا۔ داد نہ ملنے کی شکایت اگرچہ عام تھی اور اراکین بزم بھی اس شکایت کو محسوس کر رہے تھے مگر اس جمود کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ تمام مقامی و غیر مقامی شعراء کی

نشست پڑھنے والے کے عقب میں واقع تھی اور عقب تک آواز صاف سنائی دینے میں لاؤڈ سپیکر کی گڑگڑاہٹ سدِ راہ ہو رہی تھی۔
سیماب صاحب کی غزل جسے نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور جس کی زمین یہ تھی۔

ہندوستاں خطرے میں ہے سارا جہاں خطرے میں ہے

خوب کامیاب رہی۔ حفیظ صاحب کی طرحی غزل لایا گیا ہوں۔ پایا گیا ہوں کی زمین میں اچھی غزل تھی۔ ان کے پڑھنے کے انداز نے اس غزل کو اور بھی چمکا دیا۔ دو شعر یاد رہ گئے وہی پیش کرتا ہوں۔

جہاں قطرے سے ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

سپرد خاک کرنا تھا تو پھر کیوں
فنا کے بعد نہلایا گیا ہوں

دوبارہ یاد فرمایا گیا ہوں۔ یہ شعر بھی خوب تھا افسوس ہے کہ اس کا پہلا مصرعہ مجھے یاد نہیں رہا۔ اس غزل میں ایک شعر کا مصرع ثانی یہ تھا۔

کھلایا اور مرجھا گیا ہوں

اس مصرع میں کھلایا گیا ہوں تو بہ لحاظ قواعد سمجھ میں آ سکتا ہے مگر مرجھایا گیا نہیں اس وجہ سے کہ فعل لازم کا مجہول نہیں بن سکتا۔ بارِ گوش ہے۔ پوری غزل میں یہی ایک مصرع ہے جس میں کلام کی گنجائش ہے ورنہ اس قسم کی زمین میں جو حضرت شاد عظیم آبادی کی ملکیت بلا شرکت غیرے ہے ایسے اچھے اشعار نکالنا آسان

تھیں۔ حضرت شاد عظیم آبادی کے دو شعر اسی زمین میں بہت مشہور ہو
چکے ہیں۔ یہ دونوں شعر اتنے لاجواب ہیں کہ یہاں ان کا ذکر کر
دینا بے محل نہ ہوگا۔

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
لحد میں منہ چھپائے کیوں نہ جاؤں — بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

احمق پھپھوندوی کی ظریفانہ غزل بھی جو ان کے معروف انداز
سخن گوئی کا آئینہ تھی خاص توجہ سے سنی گئی۔ جناب اسد ملتانی کی
ایک نظم جس میں آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نازک مزاجی
ہجو ملیح کی صورت میں بڑی خوبی اور قابلیت سے بیان کی گئی تھی۔
سادہ بیانی کے باوجود ہر پہلو سے قابل داد تھی۔ ترنم پسندی کی
وبا دہلی میں بھی پہنچ گئی۔ میں نے دہلی کے متعدد مشاعرے دیکھے
ہیں۔ ان میں صرف دو مشاعرے ایسے تھے جو پنڈت امرناتھ صاحب
ساحر دہلوی کے زیر اہتمام اس خرابی سے قطعاً مبرا کہے جا سکتے ہیں۔
ساحر صاحب کرسمس کے ایام میں یہ مشاعرہ منعقد فرمایا کرتے ہیں۔
ترنم سے پڑھنے والے بھی اس مشاعرہ میں تحت لفظ پڑھتے ہوئے
دیکھے۔ مثلاً حضرت سیماب، نواب سائل دہلوی وغیرہ۔ مجمع بھی سخن
فہموں کا ہوتا ہے اور داد بھی فراخ دلی سے دی جاتی ہے۔ نشست
کا طریق بھی بالکل مشرقی انداز کا ہوتا ہے۔ کسی شاعر کو یہ شکایت
نہیں ہوتی کہ اسے نہیں سنا گیا۔ ان شاعروں کے سوا جن میں راقم الحروف
بھی دو دفعہ شامل ہوا۔ ٹاؤن ہال دہلی میں جتنے مشاعرے دیکھے ہیں
سب میں ترنم پسندی کا ہی دور دورہ دیکھا۔ شاعرہ زیر بحث بھی

اس خرابی سے خالی نہ تھا۔ اس قسم کی بد ذوقی کے خلاف جناب احسن مارہروی
کیا خوب فرما گئے ہیں۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

مولانا ثاقب اور حسرت موہانی ایسے مشہور شعراء کو بھی خاموشی
اور جمود کے عالم میں سنا گیا۔ تحت اللفظ پڑھنے والے تمام شعراء
حاضرین کی ترنم نوازی سے بیزار پائے گئے۔ میں نے جو طرحی غزل
اس نشست میں پڑھی اس کی زمین یہ تھی۔

تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

طرح کے تین مصرعے مشتہر کیے گئے تھے۔ شعراء کو اختیار دیا گیا
تھا کہ ان میں سے کسی ایک پر طبع آزمائی فرمائیں۔ طرح کی پابندی
میں اتنی آزادی عطا کر دینے سے ارکان بزم بہت سی نکتہ چینیوں
سے محفوظ رہے۔ مصرع طرح پر شعراء عموماً معترض ہوا کرتے ہیں
اور کہا کرتے ہیں کہ زمین شگفتہ نہیں ہے قوافی تنگ ہیں ردیف
اور قافیہ میں ربط پیدا کرنے کے لیے گنجائش بہت کم ہے۔ بحر ترنم
کے لئے موزوں نہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر تین مصرع ہائے کی موجودگی
میں اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
اراکین بزم نے کچھ تو اس قسم کی نکتہ چینی سے بچنے کے لیے اور کچھ
اس خیال سے کہ غیر طرحی مشاعروں کی طرف شعراء کا میلان طبیعت بڑھتا
جا رہا ہے۔ ایک کی جگہ تین مصرع ہائے مشتہر کر دیئے۔ میری غزل
مذکورہ بالا مصرع طرح پر بقید تک قافیہ تھی اپنار ہی کے قافیے تھے۔

اور ان میں فصل بہار، پابندی اختیار کی گئی۔ اس غزل کا صرف ایک شعر جس میں بزم اردو شملہ کی سرگرمیوں کا مذکور ہے برسبیل تذکرہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

کیا دہلی میں جلسہ شملہ والی بزم اردو نے
فراز کوہ سے میدان میں فصل بہار آگئی

دوسرے دن یعنی ۱۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو دوپہر کے بعد جناب صدر جلسہ کے دولت خانہ پر جو نئی دہلی میں ہے تمام شعراء کی دعوت تھی۔ دعوت کے بعد وہاں ایک مختصر صحبت شعر و سخن (دعوت کی قیمت وصول کرنے کے مقصد سے) باعث تفریح ہوئی۔ حاضرین میں جن کی تعداد شعراء کے علاوہ پندرہ بیس اصحاب سے زیادہ نہ تھی۔ محترمی جناب سید سر رضا علی اور جناب ملک غلام محمد صاحب صدر بزم اردو قابل ذکر ہیں۔ تقریباً تمام شعراء نے اپنا اپنا کلام بشاشت اہتمام سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ یہ مختصر صحبت بلاشبہ جان ادب کہی جا سکتی ہے۔ جناب احمق پھپھوندوی صاحب کا ایک شعر اس صحبت کی یادگار میں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اب بھی تو اپنی اصلیت کا کچھ ہے اعتراف
ورنہ احمق ہو گدھا دنیا میں افلاطون ہے

اس دعوت اور اس صحبت سے متعلق ایک مزے کی بات یہ بھی ہے کہ جناب صدر جلسہ کے دولت خانہ کا محل وقوع دہلی سے چار میل کے فاصلے پر دانسر بگیڈ روڈ سے بھی نہیں آگے جا کر نئی دہلی کی آخری حدود میں تھا۔ شعراء کو شرکت دعوت کرنے کے لئے بہت سی تاکید اور اصرار

کے علاوہ بہت سی بگ و دو بھی کی گئی تانگوں کا انتظام بھی کیا گیا۔ ایک کارکن مجھے ڈھونڈنے کے لیے تین مختلف مقامات پر جن میں سے ایک دہلی میں اور دو نئی دہلی میں تھے پہنچا بعض کے لیے موٹروں کی سہولیت بہم پہنچائی گئی۔ مگر صحبت شعر و سخن ختم ہونے پر پھر کسی نے بھی غریب شعرا کو ان کے ٹھکانوں تک پہنچانے کی پروا نہ کی۔ تانگے بھی نئی دہلی کے پر رونق مقامات ہی میں مل سکتے ہیں۔ یہاں وہ بھی نظر نہ آتے تھے ورنہ شعرا خود اپنے لیے مناسب انتظام کر لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے شعرا کس مپرسی تعداد میں تین چار میل پیدل چلنے پر مجبور ہوئے۔ خدا بھلا کرے بزم کے ایک رحم دل کارکن کا جنہوں نے اس قطار کے قریب پہنچ کر کہا کہ میرے پاس تین اصحاب کی گنجائش ہے۔ اس ارشاد کو تائید غیبی سمجھ کر تین شعرا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا کار میں بیٹھ گئے اور باقی شعرا کو خدا حافظ کہہ کر شکر خدا بجا لائے۔ میرے لئے یہ پیشکش سب سے زیادہ شکر گذاری تھی۔ کیوں کہ نیا دیسی جوتا میرے پاؤں میں عذاب جان ہو رہا تھا۔ اور میرے لیے تین چار میل کا پیدل سفر نہایت دشوار تھا۔ رات کے وقت اس مشاعرے کی دوسری نشست ٹھیک آٹھ بجے شروع ہوگئی۔ اس نشست میں براڈکاسٹ کا بھی انتظام تھا۔ چند مقامی شعرا جب اپنا کلام سنا چکے تو یہ براڈکاسٹ ایک گھنٹہ جاری رہا۔ پہلے دس منٹ جناب صدر مشاعرہ کی تقریر میں صرف ہوئے اور باقی

وقت میں دس شعراء نے پانچ پانچ منٹ وقت لے کر اپنا اپنا کلام سنایا۔ ان دس شعراء کے اسمائے گرامی ترتیب وار یہ ہیں۔

مولانا حسرت موہانی۔ عرش ملسیانی۔ جناب سیماب۔ نواب سائل دہلوی۔ حفیظ جالندھری۔ مولانا ثاقب لکھنوی۔ احسان دانش۔ راقم الحروف رجوش ملسیانی) نیرنگ انبالوی اور ایک اور صاحب تھے جن کا نام ذہن میں بھول گیا ہوں۔ نواب سائل دہلوی کی غزل بہت مشکل اور سنگلاخ زمین میں تھی۔ بہت سے اشعار بار بار پڑھوائے گئے۔ تین شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں وہی عرض کیے دیتا ہوں۔

یہ مسجد ہے یہ مے خانہ تعجب اس پہ آتا ہے
جناب شیخ نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

وہ کہتے تھے کہ ہم پھر عیادت آنے والے ہیں
عدو ہے ساتھ اب سمجھا کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تمہیں نواب بھی کہتے ہیں شاعر بھی سمجھتے ہیں
تمہارا حضرت سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اس قسم کی سنگلاخ زمین میں یہ روانی اور یہ شگفتہ بیانی قابل تحسین ہے۔ بھرم کا قافیہ کتنا دشوار تر تھا مگر کس خوبی سے باندھا ہے۔ اس پتھر کو کس حکمت سے پانی بنا دیا گیا ہے۔

براڈکاسٹ کے بعد جناب صدر جلسہ اور جناب سید سر رضا علی تشریف لے گئے۔ اب جناب نیرنگ انبالوی کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوا۔ مگر بُرا ہو ترنم پسندوں کی بد مذاقی کا اور بد ذوقی کا کہ جناب حفیظ جالندھری اور ایک دو اور شعراء کے

سوا بہت کم اصحاب کو سنا گیا۔ مخدوم صاحب اپنی مشہور و معروف نظم نور جہاں کے عنوان پر پڑھنے لگے مگر دو بند مشکل سے سُنے گئے۔ آخر وہ بھی خاموش ہو جانے پر مجبور ہوئے۔ جناب ساحر دہلوی کا متصوفانہ کلام ان رنگین مزاجوں کے مجمع میں کون سنتا۔ وہ بھی چند اشعار سنا کر خاموش ہو گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر جناب حفیظ جالندھری نے کچھ تو اپنی ظریفانہ باتوں سے اور کچھ اپنے دلکش کلام و انداز شعر خوانی سے مجمع کو تھوڑی دیر کے لئے اپنی طرف متوجہ رکھا مگر ان کے بعد وہی صدائے ضرطی اور وہی نقارخانہ۔ آخر جناب صدر نے پونے گیارہ بجے مشاعرہ ختم کر دینے کا اعلان فرمایا۔ اس نشست میں مشاعرہ کا وہی حصہ کامیاب کہا جا سکتا ہے جو براڈکاسٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ باقی وقت میں شور و غل کے سوا اور کچھ نہ تھا کارکنان بزم اردو کی خوش انتظامی تو ہر پہلو سے قابل تعریف تھی۔ ان کی شاعر نوازی اور ادب پروری میں کوئی کلام نہیں۔ ان کی سرگرم جدوجہد اور مشکور کوشش بھی قابل ستائش ہے۔ ٹکٹ لگائے جانے کی وجہ سے حاضرین کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہ تھی۔ جسے بے پناہ ہجوم کہا جا سکے۔ مگر یہ حسن انتظام یہ سرگرمی یہ ادب نوازی یہ کثیر اخراجات اس بد ذوقی کا علاج تو نہیں ہو سکتے۔ جو ترنم پسندی کی وبا کے اثر سے نوجوانوں کے دل و دماغ پر تسلط جمائے ہوئے ہے۔ اور کسی مشاعرے کو کامیاب بنانے کی تمام ممکن کوششوں کو پرکاہ سے زیادہ وقعت دینے کو آمادہ نہیں۔ اس محل

پر غالب مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

بے چہ می گویم اگر این است وضع روزگار
دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

اس مشاعرہ میں جو کلام پڑھا گیا۔ اس کی مستقل اور محفوظ یادداشت قائم رکھنے کے لیے کارکنان بزم کی یہ جدت بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ہر ایک شاعر کی طرحی اور غیر طرحی غزل یعنی اس مشاعرہ میں جو کچھ پڑھنا چاہتے تھے۔ انعقاد مشاعرہ سے چند یوم پہلے ہی ڈاک کے ذریعے خوبصورت محشی اوراق پر شعراء ہی کے دست مبارک سے لکھوا لیا تھا اور بعد میں ان تمام اوراق کو جلد بندی کی صورت میں لانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کاغذ اور کتابت و طباعت کی ناقابل بیان گرانی کے دور میں یہ تجویز خاص کر اس وجہ سے کہ ہر ایک شعر اس جلد میں مصنف ہی کے طرزِ املا اور دستخطی تحریر کی یادگار ہے نہایت اچھی اور معقول تھی۔

کراچی کا سفر اور وہاں کا مشاعرہ

مقامی شعراء اور دوسرے ادب نواز حضرات کی توجہ سے کراچی میں بزم غالب اردو ادب کی ترقی اور خواندہ اصحاب میں ادبی مذاق پیدا کرنے کے مقصد سے ۱۹۴۰ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس سال اس نے ایک مشاعرہ بھی بڑے پیمانے پر منعقد کیا تھا۔ پراکثر دیکھا گیا ہے کہ سخن نواز انجمنیں اپنے اپنے دائرِ عمل اور اپنی حدود شہر میں ادب پرور سرگرمیوں کو سال بھر میں صرف ایک سالانہ مشاعرہ منعقد کر لینے تک محدود رکھتی ہیں۔ اس کے بعد بارہ مہینے ان پر جمود کا عالم طاری رہتا ہے۔ مگر کراچی کی بزم غالب نے مذکورہ مشاعرے کے بعد بھی پندرہ روزہ مقامی مشاعرے جاری رکھے اور سال بھر میں پچیس مشاعرے منعقد کرنے کے بعد اپریل ۴۱ء میں دوسرا مشاعرہ منعقد کیا۔ جس کی روداد اس وقت زیر تبصرہ ہے۔

اتنے دور دراز شہر کے مشاعرے میں پنجاب اور یو۔پی کے شعراء بہت ہی محدود تعداد میں بلائے جا سکتے ہیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایسے صبر آزما اور طویل سفر کی تکلیف برداشت کرنے کا خیال دعوت نامہ قبول کرنے میں باعثِ انکار ہو سکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صرف تین چار شعراء کو طلب کرنے میں بھی بزم کو اخراجاتِ سفر کی گراں قدر رقم کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ شعراء کو ایسے دُور افتادہ مقام کے مشاعرے میں شامل ہونے کے لیے کم سے کم سات آٹھ دن گھر سے اور اپنے دنیاوی کاروبار سے الگ رہنا پڑتا ہے۔ ان مشکلات کی وجہ سے کسی کا یہ قول ہر ایک دعوت نامہ پر انہیں یاد آ جاتا ہے۔

جو گھر سے فالتو ہو وہ تم سے لگائے دل

اس مشاعرے کے لیے بھی صرف شمس العلماء تاجور نجیب آبادی جناب روش صدیقی اور راقم الحروف کو طلب کیا گیا تھا۔ جناب روش صدیقی وعدہ کرنے کے باوجود کسی اتفاقیہ وجہ سے شامل مشاعرہ نہ ہو سکے۔ اس لیے باہر کے شعراء کی تعداد مولانا تاجور اور راقم الحروف تک محدود رہی۔

اس زمانے کے کسی مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لیے ضرورت ہے کہ ترنم سے پڑھنے والے۔ بلکہ شعر گانے والے شعراء کو مدعو کیا جائے۔ مگر اراکین بزم غالب کو خدا جانے یہ کیا سوجھی کہ انہوں نے ایسے شعراء کو دعوت نامے بھیجے جو موسیقی سے بیگانہ محض ہیں۔ مولانا تاجور نے انہیں لکھا بھی تھا کہ آپ اپنے مشاعرے کو خراب کرنا چاہتے ہیں مگر منتظموں نے اس انتباہ کی ذرا پروا نہ کی اور اپنی طے کردہ تجویز ہی پر قائم رہے۔

میں شرکت مشاعرہ کی غرض سے یہ خیال کر کے کہ دو دن تک سفر میں نہ رہوں۔ ۹ اپریل ۱۹۴۱ء کی شام کو لاہور پہنچ گیا۔

رات وہاں آرام کیا۔ ۱۵۔ اپریل کو صبح نو بجے کراچی میل میں سوار ہوا۔ ملتان اور بہاولپور کے گرم خطے رستے میں پڑتے تھے۔ نیز اس سال موسم گرما بھی قبل از وقت شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے منٹگمری سے حیدرآباد سندھ تک کا سفر بہت ہی صبر آزما تھا۔ ملتان کی چار چیزیں مشہور ہیں۔ "گرد گرما گدا و گورستان"۔ ان میں سے دو چیزیں گرد و گرما تو ملتان دیکھے بغیر اس سفر ہی میں دیکھ لیں۔ مسافروں کی بھیڑ نے گرمی کو استنداد تک پہنچا دیا۔ گاڑی کی تیز رفتاری نے وہ خاک اڑائی کہ ملتان کا گرد و غبار بھی گرد ہو گیا۔ لباس کے علاوہ سر منہ ہاتھ پاؤں آنکھ کان ناک سب اتنے گرد آلود کہ مسافروں کی ہیئت گدائی دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ "ایں عالم دیگر است"۔ لمبی داڑھی والے اس سفر میں سب سے زیادہ شامت زدہ نظر آئے۔ گاڑی کے جھروکے بند کیے جائیں تو گرمی کی شدت اور حبس دم کھول دیے جائیں تو بے پناہ گرد و غبار کی آفت۔ مسافروں کا یہ حال کہ کوئی کپڑے جھاڑتا ہے۔ کوئی اپنی نشست صاف کرتا ہے۔ کوئی چھینکتا ہے کوئی کھانستا ہے۔ بالائی تختوں پر اگر کوئی سو گیا ہے۔ تو بے اندازہ گرد جمع ہو ہو کر اس کی شکل پہچاننی مشکل ہو گئی ہے۔ پلکیں تک گرد آلود نظر آتی ہیں۔ گاڑی دو دو ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کہیں نہیں رکتی۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر میل تک مسلسل دوڑتی چلی جاتی ہے۔ پانی کی ٹھلیا ساتھ لیے بغیر اس سفر میں گذارہ مشکل ہے۔ بار بار ہاتھ منہ دھونے اور پیاس بجھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بھی کئی دفعہ احساس ہوا کہ اس

اس مشاعرے کا دعوت نامہ منظور ہی کیوں کیا۔

خدا خدا کر کے حیدر آباد سندھ کا اسٹیشن آیا۔ اس کے بعد سمندری ہواؤں کی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ ویسے بھی صبح صادق کا وقت ٹھنڈا اور خوشگوار ہوتا ہے۔ گرد و غبار بھی اب نسبتاً کم ہو گیا تھا۔ ۱۱۔ اپریل کو لاہور سے ۲۴ گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد گاڑی کراچی پہنچ گئی۔ کارکنان بزم غالب اسٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے حسن اخلاق اور تکریم و مدارات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور مولانا تاجور شہر میں وارد ہوئے۔ پنڈت سری کرشن صاحب دہلوی بھی جو ہندی زبان کے خوش مذاق اور پختہ گو شاعر ہیں۔ اسی ٹرین سے اترے۔ میرا اور ان کا قیام ساحل بحر سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر رہا۔ مولانا صاحب شہر میں قیام پذیر ہوئے۔

اس تاریخ کو تیسرے پہر بزمِ غالب کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا تاجور نے بہ حیثیت صدر ایک پرمغز اور عالمانہ تقریر فرمائی۔ اس تقریر میں موصوف نے غالب کی شاعرانہ عظمت بڑی قابلیت سے سامعین کے دلوں پر نقش کی۔ مگر افسوس ہے کہ اس تقریر میں ذوق مرحوم کی مذمت بھی خوب کی گئی۔ اور کہا گیا کہ ذوق جذبات کے ماتحت شعر کہنا جانتا ہی نہیں۔ وہ اپنی شاعری صرف محاورہ بندی اور صنائع بدائع تک محدود رکھتا ہے۔ حالانکہ کلام ذوق میں سے اس خیال کی تردید کے لیے صدہا شعر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً شب ہجر کی سالم نظم اور ذیل کا مشہور مطلع جس نے غالب مرحوم کو بھی بیتاب کر دیا

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

بزم کی سالانہ رپورٹ اسی جلسے میں سنائی گئی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کارکنان بزمِ غالب اردو ادب کی خدمت گذاری کے لیے سال بھر نہایت سرگرم و مستعد رہے ہیں۔

رات کو ۹ بجے مشاعرہ کی پہلی نشست زیرِ صدارت مولانا تاجور صاحب شروع ہوئی۔ یہ مشاعرہ طرحی تھا۔ حاضرین کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہوگی۔ چند خواتین بھی شاملِ جلسہ تھیں۔ ان کے لیے اوپر کی گیلری میں جو بطور خاص تیار بنی ہوئی تھی۔ پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جو کلام اس مشاعرہ میں پڑھا گیا ہر لحاظ سے قابلِ داد تھا۔ مولانا تاجور صاحب صدرِ جلسہ کی طرحی غزل خاص طور سے زوردار تھی۔ مقامی شعرا میں جناب افسر صدیقی امروہوی امتیازی حیثیت کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام ہمیشہ استادانہ شان کا ہوتا ہے۔ کراچی میں شعر و سخن کا چرچا زیادہ تر انہیں کی ذات بابرکات سے وابستہ ہے۔ بہت سے مقامی نومشق انہیں کے دامنِ فیض سے وابستہ ہیں۔ اچھے معقول متین اور خلیق آدمی ہیں۔ مگر اس مشاعرہ میں کسی نامعلوم وجہ سے سامعین کی صف ہی میں رہے۔ مجھے اگلے دن بوقتِ ملاقات موصوف کی زبان سے یہ بات معلوم ہوئی اور بہت افسوس ہوا۔ حالانکہ ان کے عزیز شاگردوں کی زبانی بہ وقتِ مشاعرہ مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ آپ کچھ علیل ہیں۔ اور بوجہ علالت تشریف نہیں لا سکے۔ اگر وقت پہ معلوم ہو جاتا کہ آپ سامعین میں شامل ہیں۔

تو میں ان کا اس طرح بیٹھنا گوارہ نہ کرتا۔ اور شعراء کی صف میں بیٹھنے کے لیے گذارش کرتا۔ اپنا یہی احساس میں نے بوقت ملاقات جب میں نے عرض کیا تو موصوف نے میرے اصرار پہ یہ وعدہ فرمایا کہ آج کی نشست میں ایسا نہ ہوگا۔

بزمِ غالب کے سیکرٹری لالہ سادھو رام صاحب شاد بی۔اے اور ان کے دستِ راست لالہ مول چند صاحب کامل آخری بزم کے بڑے سرگرم کارکن ہیں۔ مشاعرے کے اہتمام و انتظام اور مہمانوں کی خاطر مدارت میں جو مستعدی و سرگرمی انہوں نے گوارا فرمائی سو وہ انہیں کا حصہ ہے۔

تقریباً بارہ بجے رات کے پہلے دن کا یہ مشاعرہ بڑی کامیابی سے ختم ہوا۔ دوسرے دن بیساکھی کا تہوار تھا۔ اسی لیے اس دن کا پروگرام یہ تجویز ہوا تھا کہ صبح سمندر میں اشنان کیا جائے اور شام کو جزیرہ منوڑا کی سیر کی جائے۔ جو بندرگاہ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پہ واقع ہے۔ اس پروگرام کے مطابق سیکرٹری صاحب اور کامل صاحب میں میری قیام گاہ پہ جو شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پہ واقع تھی، صبح کے وقت تشریف لائے۔ دو تین اصحاب اور بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ہم سب کلفٹن گھاٹ میں جو قیام گاہ سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پہ لبِ ساحل واقع ہے۔ پہنچ گئے۔ تہوار کی وجہ سے یہاں آج اچھا خاصا میلا ہو گیا تھا۔ اور شہر کے صدہا آدمی عورتیں بچے جن میں زیادہ تعداد پنجابیوں کی تھی۔ بیساکھی اشنان کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ یہ سیرگاہ بہت قابل دید ہے۔

یہاں ایک زمین دوز مندر بھی ہے۔ مگر جنگلی کبوتروں کی کثرت کی وجہ سے اسے کبوتر خانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

یہ مندر نیلے پہاڑ کو کھود کھود کر بنایا گیا ہے۔

اسے دیکھ کر ہم سب ساحل سے دو ڈیڑھ سو فٹ آگے جا کر نہانے لگے۔ پانی کی لہروں سے جن کا سلسلہ کبھی ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ خوب جنگ آزمائی ہوتی رہی۔ میرے لیے یہ منظر اس وجہ سے کہ پہلے کبھی سمندر نہ دیکھا تھا اور بھی پر لطف ثابت ہوا۔ حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ نہان سے فارغ ہو کر واپس پھرے۔ تو ان دکانوں کو بھی دیکھا جن میں سمندری اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے سیپ سنکھ گھونگھے مختلف قسم کی کوڑیاں لوگ یہاں سے خریدتے تھے۔ میں نے بھی تین پیسے کے دو سیپ جو پلیٹ کی شکل کے تھے خریدے۔ اور کراچی کی سیر و سیاحت کی لیکن اتنی ہی مادی یادگار کافی خیال کی۔

تیسرے پہر کو جناب اثر صدیقی نہایت تکلیف گوارا فرما کر بہ غرضِ ملاقات تشریف لائے۔ میرا قیام چونکہ شہر سے دور تھا۔ اس لیے موصوف کی تکلیف فرمائی اور بھی قابلِ امتنان محسوس ہوئی مگر مگر افسوس ہے کہ یہ مسرت انگیز ملاقات زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ تھوڑی دیر تک رسمی گفتگو ہو چکنے کے بعد میں موصوف سے کچھ افکار تازہ سننے کی فرمائش کرنے کو تھا کہ سیکرٹری صاحب مولانا تاجور صاحب کے پروگرام کے مطابق کار میں تشریف لائے اور بندرگاہ بنر جزیرہ منوڑا کی سیر کے لیے مجھ سے شامل ہونے کو کہا۔ شام کا وقت نزدیک تھا۔ اس لیے جناب اثر صدیقی نے سلسلہ ملاقات

منقطع کردینے کے لیے بڑی فراخ دلی سے ہمیں نے اظہارِ معذرت
کو قبول کیا۔ پنڈت ہری کرشن صاحب دہلوی شادؔ صاحب اور ہمیں
اور مولانا تاجورؔ صاحب کار کے ذریعے تھوڑی ہی دیر میں بندرگاہ پر
پہنچ گئے۔ اور چند منٹ بندرگاہ کے خوبصورت منظر دیکھتے رہے
حسنِ اتفاق سے سواری کا ایک جہاز بھی اس وقت بندرگاہ سے روانہ
ہوا۔ قریب سے اسے بھی دیکھا۔ باربرداری کے ایک دو جہاز اور بھی
لنگرانداز تھے۔ یہاں پانی کی گہرائی زیادہ ہے۔ اس لیے بادبانی جہاز
اور دخانی کشتیوں کے ذریعے منوڑا تک جا سکتے ہیں۔ ایک بادبانی کشتی
کے ملاح سے ایک آنہ فی کس کرایہ چکایا اور سوار ہونے کے لیے
زینے کے ذریعے نیچے اُترے۔ مولانا تاجورؔ صاحب کو یا تو
فی الحقیقت ڈوب جانے کا خطرہ لاحق ہوا یا دل لگی سوجھی۔ فرمانے
لگے کہ میں تو وصیت نامہ لکھ کر نہیں آیا۔ میں نے گذارش کی کہ میں
بڑا تیراک تو نہیں۔ مگر جان بچانے کے لیے دس بیس گز تک پاؤں
ہاتھ مار سکوں گا۔ منوڑا دور بھی نہیں ہے۔ سہارے کے
لیے سینکڑوں لنگر پانی کی سطح پر نظر آرہے ہیں۔ آپ بھی وہم نہ
کیجیے۔ صدہا کشتیاں امداد کے لیے موجود ہیں۔ پھر فرمایا کہ ممکن
ہے یہ مد کا وقت ہو۔ میں نے عرض کی کہ وقت تو جزر کا ہے۔
اس وہم کو چھوڑ دیجیے اور ہر چہ باداباد کشتی در آب انداختیم پر عمل
کیجیے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک انگریز عورت تن تنہا اپنی کشتی چلاتی
ہوئی نظر آئی۔ میں نے مولانا کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اسے دیکھ کر
مولانا بھی مان گئے۔ کشتی میں سوار ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں منوڑا

پہنچ گئے۔ یہ جزیرہ سطح بحر سے پندرہ بیس فٹ اونچا ہے۔ رقبہ ایک مربع فرلانگ کا ہوگا۔ ہم سب پیدل چل کر اس کی دوسری سرحد پار پہنچ گئے۔ یہاں سمندر کا منظر اتنا دلکش تھا کہ شنید نہیں بلکہ دید ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ لہروں کا پانی اچھل اچھل کر بیس بیس فٹ باہر کو آتا تھا۔ لہریں بھی کلفٹن گھاٹ کی لہروں سے زیادہ زوردار تھیں۔ ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا کے تیز جھونکے دل و دماغ میں فرحت پیدا کرتے تھے۔ جو جہاز ہم نے بندرگاہ سے روانہ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اب دور ہو چکا تھا۔ اور یہاں سے ایک گنبد کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ جزیرہ میں ایک مندر بھی ہے۔ ایک سینما بھی ہے۔ ہوٹل بھی ہے۔ مختلف قسم کی دکانیں بھی ہیں۔ عام ضروریات زندگی یہاں مہیا نظر آتی ہیں۔ پارسی عورتوں کا ایک گروہ دیکھا جو خود ایک میخانہ ہونے کے باوجود بلا امتیاز عمر شراب نوشی کر رہی تھیں۔ جس طرح یوپی میں پان اور پنجاب کے دیہات میں حقہ خاطر و مدارات کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح ان لوگوں میں شراب خاطر تواضع اور مدارات کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ پینے کا ڈھنگ بھی جدت سے خالی نہ تھا۔ لڑکیاں جوان عورتیں ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتیں ایک قطار کی شکل میں صف بستہ کھڑی تھیں۔ پلانے والا ریتی سب کو باری باری پلا رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس چشمہ فیض سے کوئی عورت محروم نہیں رہی۔ سو اتفاق کہئے کہ واپسی میں ہم جس دخانی کشتی میں سوار ہوئے۔ اس میں یہ جماعت بھی سوار ہوئی۔ اگرچہ ان کی گفتگو تو خاک بھی ہماری سمجھ میں نہ آتی تھی مگر ان کے چلبلے انداز مخمور لگا ہوں

کیف پر ور قہقہوں مستانہ اداؤں اور ایسی چھیڑ چھاڑ میں ہمیں
رباعیات عمر خیام کا لطف آرہا تھا۔ اس وقت سات بج چکے تھے۔
برقی چراغوں کی روشنی نے سمندر کا منظر اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔
آنکھوں میں نور اور دل میں سرور اصل صورت میں یہیں دیکھا۔ دخانی
کشتی بادبانی کشتی سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے۔ اس سے ہم
دیکھتے ہی دیکھتے بندرگاہ تک پہنچ گئے۔ اور اپنی اپنی قیام گاہ کی
طرف روانہ ہوئے۔

آج کا مشاعرہ جو راقم الحروف کی صدارت میں تھا۔ کل کے
مشاعرے سے زیادہ پر رونق زیادہ پر لطف اور زیادہ کامیاب رہا۔
اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ صحبت غیر طرحی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے
کہ اس میں جناب ممتاز نگر جناب داغ دہلوی بھی جو چند یوم سے
کراچی ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ شامل مشاعرہ ہوئے۔ اور انہوں نے
اپنے کلام سے حاضرین کو خوب محظوظ فرمایا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جناب
اثر صدیقی بھی آج حسب وعدہ صف سامعین چھوڑ کر شعرا کی صف میں
شامل رہے اور اپنی خوش بیانی سے بھی مشاعرے کو خوب چمکایا۔
ان کے علاوہ جناب رضا لکھنوی بھی جو اپنی ملازمت کے سلسلے میں کراچی ہی
میں قیام فرما ہیں۔ تشریف فرمائے مشاعرہ ہوئے۔ ایک بجے یہ پر لطف
صحبت ختم ہوئی۔ تو بزم تنویر کراچی نے اپنا طرحی مشاعرہ شروع
کر دیا۔ اس مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی۔ کہ جو اصحاب پڑھنے والے
تھے وہی سننے والے تھے۔ حاضرین میں ایسا کوئی نہ تھا جسے صرف
سننے والا کہا جا سکے مولانا نا تو صاحب اور جناب اثر صدیقی کا کلام

خاص طور سے قابلِ ستائش تھا۔ ممتاز صاحب کی غیر طرحی غزل مستغنی عن التوصیف تھی۔ اس غزل کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔ وہی عرض کیے دیتا ہوں۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

ادا قاتل نظر قاتل تمہارا گھر کا گھر قاتل
مصیبت یہ کہ رہنا ہے انہیں کے درمیاں مجھکو

۱۳۔ اپریل کی رات کو تیسرا مشاعرہ مناظمہ کی صورت میں تھا۔ اس کے لیے مختلف عنوان تجویز کیے گئے تھے۔ مگر مجھے شام کی گاڑی میں روانہ ہونے کی عجلت تھی۔ افکار خانہ داری اس پر لطف صحبت کا سلسلہ منقطع کر دینے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس لیے اس مشاعرہ میں شامل نہ ہونے کا افسوس رہا۔ مقامی اصحاب ۱۴۔ اپریل کی شام کو بھی ایک مشاعرہ منعقد کرنے والے تھے۔ اس کے لیے بھی انہوں نے بار بار اصرار کیا۔ مگر مجھے انکار کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ مقرر کردہ عنوانوں میں سے ایک عنوان شام جوانی تھا۔ میں نے اس عنوان پر ایک نظم بھی اس نشست کے لیے لکھی تھی۔ اراکینِ بزم نے وہ نظم اس خیال سے کہ یہ اب نہیں رکھتے الوداعی پارٹی کے موقع پر جو میری روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے بڑے تکلف سے منعقد کی گئی تھی اور جس میں نو ٹو بھی لیا گیا تھا۔ سن لی۔ اس کے بعد میں اس پر لطف صحبت سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہو گیا۔ چند اراکین بزم غالب کی عنایات و الطاف کا یہاں شکریہ ادا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان اصحاب نے میری آمد اور میری روانگی کے ہر دو اوقات میں ریلوے اسٹیشن پر تشریف لانے کے لیے بہت تکلیف گوارا فرمائی۔ اور ہر طرح کا آرام بہم پہنچانے کی کوشش

میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

گاڑی اگلے دن ملتان اسٹیشن پر پہنچی۔ تو مسٹر ظفر ادیب نے ایک دن ملتان قیام کرنے کے لیے اصرار بلیغ کیا۔ گرد و گرما کی سیر تو پہلے ہی بہت اچھی طرح ہو چکی تھی۔ باقی گدا و گورستان رہ گئے تھے۔ اس خیال سے کہ ان چیزوں کی سیر بھی ہو جائے گی۔ میں ایک دن کے لیے ملتان ٹھہر گیا۔ رات کے وقت یہاں بھی مقامی شعراء کی ایک مختصر صحبت میں شامل ہوا۔ اور دو ڈھائی گھنٹے شعرائے ملتان کی خوش بیانیوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ صبح کو جناب ودیا پر کاش سرور کے ہمراہ شہر کی سیر بھی کی۔ ملتان کے مشہور خادمِ قوم لالہ بال کرشن صاحب بترا وکیل سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ موصوف اخبار اقبال کے اڈیٹر ہونے کے علاوہ بہت سی مقامی تحریکوں کے سرپرست اور روحِ رواں ہیں۔ آپ بیر تخلص فرماتے ہیں۔ ان سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔ اس کے بعد دو تین مشہور زیارت گاہوں کو دیکھ کر سناتن دھرم ہائی اسکول میں پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری ناگہانی آمد پر تمام طلبا اور اسٹاف کو اسکول کے ہال میں جمع ہونے کا حکم صادر فرمایا اور تعارفی تقریر کے بعد مجمع کچھ سنانے کیلئے ارشاد فرمایا۔ میں نے فیشن کی تباہ کن خرابیوں پر طلبا کو متوجہ کیا۔ اور نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔ اس سادہ زندگی کا نمونہ میں خود بھی ان کے سامنے موجود تھا۔ اس کے بعد ایک نظم "غریبوں کی دنیا" سنائی۔ جو پسند کی گئی۔ روانگی کا وقت قریب تھا اس لیے مزید فرمائش کی تعمیل سے انکار کرنا پڑا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی کریمانہ نوازش اور ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے بھی رخصت ہوا۔ اور روانہ ہو کر آٹھ دن کے بعد گھر پہنچا۔ گھر والوں نے کہا کہ مشاعرہ کا جنون کسی کو کم سے کم اتنا تو ہو۔

لائل پور کاٹن ملز کا سالانہ مشاعرہ

لائل پور کاٹن ملز پنجاب میں روئی اور کپڑے کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔ یہاں چھ سات ہزار مزدور اور کاریگر کام کرتے ہیں۔ ان کی دلبستگی اور تفریح کے لیے بھی کارخانہ کے وسیع میدان میں بہت سے مشاغل مہیا کیے گئے ہیں۔ ایک تھیٹر ہال بھی ہے۔ جہاں باذوق مزدور خود ایکٹر بن کر مختلف قسم کے مفید ڈرامے کرتے ہیں۔ اور اس کام کے لیے کسی تھیٹریکل کمپنی کے محتاج نہیں ہیں۔ اصل نظر اصحاب کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ڈرامے ہر پہلو سے قابل تعریف اور لائق توصیف ہوتے ہیں۔ ان مختلف مشاغل کے علاوہ ہر سال ماہ فروری یا مارچ میں مزدوروں اور کاریگروں کا ایک پُرلطف میلہ بھی منعقد ہوا کرتا ہے میلے کے دنوں میں دو تین دن کارخانہ بند رہتا ہے اور تفریح طبع کے لیے اس نقصان کی پروا نہیں کی جاتی۔ میلے کے ساتھ مقامی مصنوعات کی ایک نمائش بھی ہوتی ہے۔ تماشے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف قسم کی ریاضت جسمانی نشانہ بازی تیراندازی وغیرہ کے انعامی کھیل بھی باعث تفریح ہوتے ہیں۔ موسیقی کا جلسہ بھی ہوتا ہے۔ کاریگروں اور کارکنوں کی ادبی تفریح کے لیے ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوا کرتا ہے۔ اور ان تمام مشاغل کے کثیر اخراجات بخوشی برداشت کیے جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان مختلف قسم کے مشاغل ر

تفریحات کے لیے حسن انتظام بہت ہی قابلِ داد ہوتا ہے۔ کارخانہ کے والنیٹر قدم قدم پر اپنے فرائض کو ادا کرنے میں سرگرم اور مستعد نظر آتے ہیں۔ جسمانی کھیل میں کسی کو ناگہانی چوٹ آجاتے تو مضروب کے لیے ابتدائی مرہم پٹی (فرسٹ ایڈ) کا سامان بھی موجود ہوتا ہے۔ تماشائیوں کے لئے کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا اور ان کی ضروریات کے لیے پھل مٹھائی اور دیگر خورد و نوش کی دکانیں بھی آراستہ ہوتی ہیں۔ نمائش میں ایک حصہ کارخانہ کی مصنوعات کے لیے بھی وقف ہوتا ہے۔

کارخانہ اور مشاعرہ بظاہر دو متضاد سی باتیں ہیں۔ مگر جب اس نکتہ پہ غور کریں کہ ہر قسم کے انسانی مجمع میں خواہ وہ غریبوں اور مزدوروں ہی کی بیشتر تعداد پر مشتمل ہو۔ ادبی ذوق رکھنے والے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ اور جب مالکان کارخانہ بھی یہ ذوق رکھتے ہوں تو اس قسم کا ادبی اجتماع قابلِ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ شعراء کی جماعت بھی الفاظ اور معانی کی صناع ہے۔ اس لیے صناعوں کی جماعت سے اسے الگ شمار کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ انعقاد مشاعرہ کی یہ وجوہ اور محرکات بیان کرنے کے بعد یہ اظہارِ حقیقت بھی ضروری ہے۔ کہ لالہ مرلی دھر صاحب شاد دہلوی اس کارخانہ کے روحِ رواں اور اس کے مالکان میں سے ہیں۔ وہ اپنی ادب نوازی ادب پروری اور بہترین مذاق سخن کی وجہ سے معروف ہستی ہیں۔ محترمی جناب بیخود دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں۔ اور شعر سمجھتے بھی خوب ہیں۔ مشکل مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا شوق رکھتے ہیں۔ اور پھر بھی بہت صاف اور ہموار شعر نکال لیتے ہیں۔ بیان کی صفائی اور شعر کی ہمواری

جو خاندان داغ مرحوم کا طرّہ امتیاز ہے۔ ان کے کلام میں بھی مشکل زمینوں کی مشکلات کے باوجود بدرجہ اتم پائی جاتی ہے سو وہ ان فراخ دل اور اولوالعزم خادمان ادب میں سے ہیں۔ جن کی مسیحا نفسی اردو زبان اور اردو شاعروں کے لیے آب بقا کا حکم رکھتی ہے۔ اپنے بلند پایۂ استاد کے احترام اور پاس شناس و خدمت گذاری میں بھی وہ ہر ایک سخن گو کے لیے باعثِ تقلید ہیں۔ ناظرین کرام اب بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ اس مشہور کارخانہ کے سالانہ میلے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے مشاعرے کے انعقاد کے لیے کتنے زبردست محرکات موجود ہیں۔

فروری ۱۹۴۴ء کی طرح اس سال ۱۴/۱۵ مارچ سنہ ۴۵ء کو یہاں سالانہ میلے کے ساتھ نمائش اور دیگر تفریحات کے علاوہ ایک قابلِ دید مشاعرہ کارخانہ کے تھیٹر ہال کی خوبصورت اور دلکش عمارت میں منعقد ہوا۔ آج کل کے ریلوے سفر کی صبر آزما بلکہ ہمت شکن مصیبت کا خیال کیا جائے تو اتنے دور دراز فاصلوں سے خوش بیان اساتذہ اور تر زبان شعرا کو لائل پور آنا داعیان مشاعرہ کی بالعموم اور شاد صاحب کی بالخصوص سرگرم جد و جہد کا ثبوت ہے۔ آپ خیال فرمائیں۔ کہاں نسارہ ضلع الہ آباد اور کہاں لائل پور کالے کوسوں دور کی منزل بے پناہ ہجوم کی دھکا پیل سیکنڈ کلاس میں بھی بسا اوقات کھڑے ہو کر سفر کرنا بے خوابی بے آرامی غرض بیسیوں تکالیف ہیں۔ پھر بھی نا خدائے سخن حضرت نوح ناروی طوفان سخن ساتھ لے کر یہاں تشریف لائے۔ جناب بیخود دہلوی بوجہ اختلاط نو سی۔ و ضعف پیری اب دہلی کے مشاعروں میں شاذ و نادر ہی شامل ہوتے ہیں۔ مگر اپنے سعادت اطوار اور عقیدتمند

شاگرد کے اصرار بلیغ پر وہ بھی بہ ہزار جبر تقبیل یہاں پہنچ گئے۔
اور بزم سخن کی زینت دوبالا کی۔ ان بزرگوں کے علاوہ جناب کیفی دہلوی
حضرت زار دہلوی راقم الحروف حضرت بے خود دہلوی کے تین سربرآوردہ
تلامذہ یعنی یکتا صاحب۔ محمود صاحب پاٹودی والے اور حکیم نانند صاحب
دہلوی جو بنارس میں رہتے ہیں۔ اور وہیں سے سیدھے لائل پور پہنچے۔ نواب
سائل کے فرزند فصیح صاحب خود بھی تشریف لائے اور اپنے والد محترم
کی طرحی غزل بھی ساتھ لائے۔ سید عباس حسن صاحب دہلوی ظریف۔
احسان دانش۔ انور صابری۔ صابر دہلوی۔ حضرت نوح ناروی کے ایک
شاگرد جدت صاحب (جن کے مذاق میں جدت نام کا نام تک نہیں)
ماہر القادری۔ جناب محروم کے خلف الصدق لالہ جگن ناتھ آزاد
سید فرزند۔ حضرت بیخود دہلوی۔ گلزار صاحب فرزند۔ حضرت زار صاحب
سردار اودھے سنگھ شائق۔ خلیق قریشی۔ منظور لائل پوری۔ اختر رضوانی
سردار تخت سنگھ۔ دمّا دہلوی۔ رمتوی تیر آبادی اور ان کے علاوہ
اور بہت سے شیریں گفتار شعراء جن کے اسمائے گرامی مجھے یاد
نہیں رہے۔ شامل مشاعرہ ہوئے۔ اس فہرست کو ملاحظہ کرنے سے
معلوم ہو سکتا ہے کہ داعیان مشاعرہ کی سرگرم کوشش یا کشش مشاعرہ
کو کامیاب بنانے کے لیے کتنی دور رس اور کتنی موثر ہے۔ اور جب یہ دیکھا جائے
کہ بہت سے خوش کلام شعراء اپنی مجبوریوں کی وجہ سے باوجود اصرار پیہم
شریک مشاعرہ ہونے سے معذور رہے۔ اور داعیان مشاعرہ کو ان
اصحاب کی عدم شرکت کا بہت افسوس رہا تو ان کی سرگرم جد و جہد کا ہمہ گیر
پہلو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

..یہاں منتظمانِ مشاعرہ کے حسن انتظام اور قابلِ تقلید مہمان نوازی کا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی کے مترادف ہوگا۔ شعراء کو ریلوے اسٹیشن سے کارخانہ کی عمارت میں لانے اور واپسی پر اسٹیشن تک پہنچانے کا معقول انتظام تھا۔ وسیع میدان میں قیام کے لیے بہت سے خوبصورت خیمے نصب تھے۔ بعض شعراء کے قیام کا انتظام ایک وسیع کوٹھی میں تھا۔ مگر کوٹھی ہو یا خیمہ خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا ہر جگہ پورا خیال رکھا گیا چھوٹی چھوٹی باتوں پر خاص توجہ مبذول کی گئی۔ مہمانوں کی تمام تر ضروریات اور جملہ تکالیف کا خیال رکھنا آسان کام نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ فرض سب سے مشکل فرض ہے۔ بہت کم میزبان ایسے ہوتے ہیں۔ جو اس مشکل فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ جلسوں پر زرِ کثیر خرچ کرنے والے فراخ دل میزبان بھی اس پہلو میں ہدفِ ملامت اور موردِ شکایات دیکھے گئے ہیں۔ منتظمانِ مشاعرہ اس لحاظ سے بھی قابلِ مبارکباد ہیں اور ان کا یہ نمایاں وصف اور قابلِ شکر گزاری ہے۔ کہ اگر کسی فروگذاشت کی طرف جو خواہ اتفاقیہ ہی تھی۔ انہیں توجہ دلائی گئی تو وہ بار بار اظہارِ معذرت کرتے نظر آئے۔

پہلی نشست ۱۴ مارچ کی رات کو نو بجے شروع ہوئی۔ یہ نشست طرحی تھی۔ مصرعِ طرح تو مجھے یاد نہیں رہا ہاں زمین یاد ہے۔ یعنی بحر رمل مثمن مقصور محذوف حسرت صورت وغیرہ قافیہ اور دیکھی ردیف پڑھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی۔ کہ طرحی مشاعرہ ڈھائی بجے تک جاری رہا۔ دہلی کے زندہ دل ادیب شہیر خواجہ محمد شفیع صاحب صدر مشاعرہ حضرت بیخود دہلوی کی طرف سے بطور قائم مقام صدر یا سیکرٹری کی حیثیت میں مائیکروفون کے ذریعے شعراء کو حاضرین سے

متعارف کرتے رہے۔ تعارف کے لیے خواجہ صاحب موصوف خاص قابلیت کے مالک ہیں۔ ان کی برمحل اور شگفتہ تمہیدی تقریر سے حاضرین معمولی شاعر کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے۔ اور اس کا کلام شوق اور سکوت سے سنتے تھے۔ یہ انہیں کی بذلہ سنجی اور شگفتہ طبیعت کا کرشمہ ہے کہ لگاتار ساڑھے یا پانچ گھنٹے یہ صحبت شعر و سخن سامعین کی توجہ کو کشش کرتی رہی اور کسی نے بھی بے خوابی کی تکلیف محسوس نہیں کی۔

اس نشست میں ہر شاعر کو حروف ابجد کی ترتیب سے پڑھوایا گیا۔ تاکہ تقدیم و تاخیر کی شکایت پیدا ہی نہ ہو سکے۔ شروع میں حضرت داغ مرحوم کی ایک غزل کے چند اشعار بطور تبرک پڑھے گئے۔ اس کے بعد شعرائے کرام نے اپنی اپنی طرحی غزل سنا کر خوش بیانی کی داد دی۔ حضرت نوح ناروی نے اپنی طرحی غزل سنانے سے پہلے دو تین پر لطف قطعات بھی جو حسب موقع اور برمحل تھے۔ سنا کر لطفِ صحبت کو دوبالا کیا۔ ان قطعات میں سے ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

شاد نے خاص توجہ سے جو بلوایا ہے ۔ تو کچھ اشعار سنانے کے لیے آیا ہے
قابل نذر کوئی نوح کو تحفہ نہ ملا ۔ اپنے ہمراہ یہ طوفان سخن لایا ہے

اس نشست میں شعرا نے جو کلام پڑھا وہ ہر لحاظ سے بہترین اور قابل ستائش تھا۔ چونکہ اس کا ضروری اقتباس بھی تین چار صفحوں میں سما سکے گا۔ اس لیے بہ خیال طوالت صرف قیامت کے قافیے کا ایک ایک شعر بطور انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین بھی اس ہنگامہ قیامت کی سیر سے لطف اندوز ہو سکیں اور یہ روداد بھی تشنہ تکمیل نہ رہے۔

انور ہاشمی
آپ تو گزرے جھکاتے ہوئے اپنی نظریں
دیکھنے والوں نے کیا کیا یہ قیامت دیکھی

احسان دانش
دل کو عصیاں پہ عموماً وہ ندامت دیکھی
حشر پہ حشر قیامت پہ قیامت دیکھی

بیخود دہلوی
دل تڑپتا ہوا بگڑی ہوئی قسمت دیکھی
ہجر کی رات قیامت سی قیامت دیکھی
آپ کی شوخیِ رفتار کہاں اس کو نصیب
ٹھوکریں کھاتی ہوئی ہم نے قیامت دیکھی
ٹھوکروں سے تری اٹھی تھی تو شرما جاتی
ناز کرتی ہوئی کم بخت قیامت دیکھی
نیچی نظروں نے اٹھائے ہیں ہزاروں فتنے
سرنگوں آپ کی محفل میں قیامت دیکھی

جعفر شیرازی
وہ نقابوں میں بھی تھے حشر بداماں جعفر
ہاتھ سے پردہ اٹھایا تو قیامت دیکھی

جوش ملسیانی
سلسلہ رنج و مصیبت کا نہ ٹوٹا اک دن
ہم نے ہر ایک سحر صبح قیامت دیکھی

خاور
نیچی نظروں نے وہاں بھی نہ کہیں کا رکھا
اہلِ محشر نے قیامت میں قیامت دیکھی

زار دہلوی
کس کی رفتار نے تلووں سے لگا دی اس کے
تلملاتی ہوئی پھرتی جو قیامت دیکھی

good ۱

سائل دہلوی
سال ہا سال رہا سلسلۂ رنج و طرب
رات جنت میں کٹی دن کو قیامت دیکھی

سید دہلوی
قصۂ طول شبِ غم کا خلاصہ یہ ہے
ہم نے پہلے ہی قیامت سے قیامت دیکھی

شاد دہلوی
اس کے نقشِ کفِ پا سے بھی وہ کوسوں بھاگا
جس نے اس شوخ کی رفتارِ قیامت دیکھی

صادق
نقشِ پا کس کے ہیں یہ کون یہاں آیا تھا
چلتی پھرتی ترے کوچے میں قیامت دیکھی

صدیق دہلوی
حشر دیکھا تری چالوں سے جہاں میں برپا
رہ گذر میں تری جب دیکھا قیامت دیکھی

عارف
صف عشاق سے کترا کے چلا تھا کوئی
فتنۂ حشر پکارا یہ قیامت دیکھی

ظریف دہلوی
کیا خبر تھی کہ چھپے بیٹھے ہیں اتّا صاحب
ہاتھ سے پردہ اٹھایا تو قیامت دیکھی

قمر سلیمانی
اک نئی صبح کے آثار نمایاں ہیں قمر
وقت سے پہلے زمانے میں قیامت دیکھی

کیفی دہلوی
وہ تبسّم کی ادا بھول نہیں سکتی ہے
رقص کرتی سرِ گل برگِ قیامت دیکھی

نوحؔ ناروی

ناخدائے سخن فصیح العصر تاج الشعراء حضرت نوحؔ ناروی جانشین حضرت فصیح الملک داغؔ دہلوی کے نامور شاگرد اور جانشین ہیں۔ حضرت داغؔ کی زندگی ہی میں ان کا کلام استاد کے کلام سے ملتا جلتا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ قصبہ نارہ ضلع الہ آباد کے رئیس ہیں۔ بہت با اخلاق بہت وسیع مشرب اور مرنجاں مرنج طبیعت بزرگ ہیں۔

بیان کی شوخی زبان کی صفائی محاورات کی بے تکلفی الفاظ کا پسندیدہ الٹ پھیر حضرت داغؔ کے کلام کی طرح ان کے کلام میں بھی قابل دید ہے۔ دو دیوان "سفینۂ نوحؔ" اور "طوفان نوحؔ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ دونوں نایاب ہیں۔ تیسرا دیوان "اعجاز نوحؔ" کے نام سے جلد تر منظر عام پر آنے والا ہے۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد جانشینی کے جھگڑے بہت دیر تک چلتے رہے۔ اور اس کے مدعی بہت سے تھے لیکن جب سے نواب سائلؔ دہلوی نے اپنی تحریر کے ذریعے آپ کو حضرت داغؔ کا جانشین

مان لیا اس وقت سے اس بحث میں خامہ فرسائی کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب نے آپ کو جانشین مان لیا۔ البتہ ایک بڑی جماعت نے اس کو تسلیم کر لیا۔ اور تین چار اصحاب مخالف رہے۔

ہجویہ کلام سے ان کا دامن پاک ہے۔ غلط شعر سُن کر بھی خاموش رہتے ہیں۔ اور کسی کی دل شکنی گوارا نہیں کرتے۔ استادوں کا ادب و احترام اس حد تک ہے کہ ان کی زمین میں غزل کہنی سوء ادب خیال کرتے ہیں۔ نئی نئی زمینیں خود ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایسی غزلیں بہت کم ہیں جو پامال زمینوں میں لکھی ہوئی ہوں اگر کسی پرانی زمین میں غزل کہی ہے تو اسے مشاعرے کے مصرع طرح کی پابندی اور مجبوری سمجھنا چاہیئے ورنہ کسی استاد کی زمین میں کچھ کہنے پر طبیعت اگر مائل ہو گئی ہے تو ردیف یا قافیہ یا بحر میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتے ہیں تاکہ بے ادبی سے بچ جائیں۔

کلام کی داد دینے میں بھی وہ بہت فراخدل ہیں۔ اور اس خاص وصف کی وجہ سے بھی کسی مشاعرے میں ان کا موجود ہونا غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اس گئے گذرے زمانے میں بے چارے شعرا کو صرف واہ واہ ہی اُڑاتے لیے پھرتی ہے۔ اگر اس میں بخل روا رکھا جائے تو فی الواقع شاعر کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت داغ ہی کے شاگردوں میں ایک نامور شاعر جن کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں (واقف صاحب اس بیان سے خود ہی سمجھ جائیں گے)

کچھ ایسی انتقاد طبیعت رکھتے ہیں اور کچھ ایسے بے باک واقع ہوئے ہیں کہ مشاعرے میں اگر کسی نے کسی سے مکرر ارشاد ہو کہہ دیا تو یہ فوراً بول اُٹھتے ہیں کہ نہیں کوئی اس کی ضرورت نہیں۔ ہم عصروں کا کلام سنتے ہیں۔ انصاف طبیعت پر غالب آگیا ہے تو کسی شعر پر یہ ارشاد ہو جاتا ہے کہ یہ قافیہ آپ نے مجھ سے اچھا باندھا ہے ورنہ ہر شعر پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ قافیہ میں نے اچھا لکھا ہے۔ مختلف بہانوں سے ان کو مجلس سے الگ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ صحبت میں بے لطفی پیدا نہ ہو بعض شعرا ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ کسی کے کلام پر سر ہلانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اور اچھے سے اچھے شعر کی داد دینے میں نہایت بخل سے کام لیتے ہیں۔ مگر بر خلاف ان کے حضرت نوح غلط اور سقیم شعر کو خاموش رہیں تو رہیں ورنہ ہر اچھے شعر کی داد دینے میں بہت ہی فراخدل ہیں اور یہ بات کچھ تصنع سے نہیں ذوق سخن ہی ان کو بے اختیار کر دیتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ اہل ذوق ان کے پایۂ سخن کا کوئی صحیح اندازہ کر سکیں یہ جان لینا ضروری ہے کہ انہوں نے متروکات فصحائے حال کے علاوہ بہت سی ایسی پابندیاں اختیار کر رکھی ہیں جو آج تک کسی نے اختیار نہیں کیں۔ مثلاً وہ قائل بسمل مشکل وغیرہ قافیوں کے ساتھ مائل۔ حائل حمائل وغیرہ قوافی مطلع میں بالمقابل نہیں لاتے۔ حالاں کہ تمام اساتذہ سابق و حال نے یہ تمام قوافی مخلوط لکھے ہیں۔ یعنی کوئی مطلع قاتل بسمل

وغیرہ قوافی کا حامل ہے تو کوئی مائل حائل وغیرہ کا بھی لکھ دیا ہے۔
اسی طرح وہ دریا صحرا کے ساتھ جلوہ شعلہ وغیرہ کے قافیے بھی
ترکیبی صورت میں نہیں لاتے۔ مطلع اول کے دونوں مصرعوں میں
قافیے اگر اُردو زبان کے ہیں تو غزل کے باقی اشعار میں بھی اُردو
ہی کے قافیے لکھیں گے۔ کوئی فارسی کا قافیہ نہیں آنے دیں گے۔
اور اگر مطلع اوّل میں فارسی یا عربی کے قافیے آئے ہیں تو غزل
میں بھی اُردو کا کوئی قافیہ نہ ہوگا۔ اگر مطلع اوّل میں ایک مصرع
کا قافیہ اُردو کا اور دوسرے میں فارسی کا ہے تو صرف اس صورت
میں مخلوط قافیے باقی اشعار میں لکھیں گے۔ اس کے علاوہ اگر
دو لفظ مل کر بامعنی لفظ ہو جاتے ہیں۔ تو اسے نہیں لکھیں گے
مثلاً ہے اور جان کو بالاتصال نہیں آنے دیں گے۔ کیوں کہ ان
کے ملنے سے لفظ ہیجان بن جاتا ہے۔ کوئی لفظ سین پر ختم ہوتا
ہے۔ تو اس کا مابعد ایسا نہ لکھیں گے۔ جو سین سے شروع ہوتا
ہے۔ اور تنافر کا سقم پیدا کر دیتا ہے۔ پر کی جگہ پہ نہیں لکھتے۔
کھا کر اٹھا کر کی جگہ کھا گئے اٹھا کے نہیں لکھتے۔ ارمان کے
ساتھ مہمان سامان یا چمن کے ساتھ انجمن کا قافیہ مطلع میں
نہیں لاتے۔ کیوں کہ حرف روی سے پہلے میم دونوں میں مشترک
ہے وغیرہ وغیرہ۔

بادی النظر میں ان پابندیوں کو شاید لزوم مالایلزم سمجھا جائے
اور یہ کہا جائے کہ یہ شعر کو پابہ زنجیر کر دینے کی کوشش ہے
اور اس سے شعر گوئی میں بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور

یہ دشواریاں پہلے ہی کچھ کم نہیں جو ماہرینِ فن نے اردو فارسی کی شاعری پر عاید کر رکھی ہیں۔ ایک مبتدی کی غزل پر فنی لحاظ سے تنقید کی جائے تو وہ بے چارا متحیر ہو جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اتنی پابندیوں کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنے خیالات آزادی سے کس طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ ایک شخص اچھی مثنوی بحر ہزج مثمن سالم میں لکھتا ہے۔ مگر جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی کی مقررہ سات بحروں سے باہر ہے تو اس کو اپنی محنت پر افسوس ہوتا ہے۔ ان بے انتہا پابندیوں پر اتنی کڑی بندشیں جو حضرت نوح نے التزاماً اختیار کر رکھی ہیں اور بڑھا دی جائیں تو شعر کہنا سخت دشوار ہو جاتا ہے مگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ پابندیاں پابندیاں نہیں بلکہ اصولی باتیں ہیں۔ اصلاحات ہیں اس لیے قابل قدر ہیں اور ضروری ہیں۔

اس رائے سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اتفاق نہ ہو مگر اس مضمون میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ باوجود ایسی دشوار پابندیوں کے اردو شاعری میں حضرت نوح نے کس قدر کمال دکھایا ہے اور شہبازِ تخیل نے پہلے سے بھی زیادہ رشتہ بپا ہو کر کتنی رفعت تک پرواز کی ہے۔ ایسی کڑی زنجیریں بڑھا دینے پر بھی اگر کوئی ساحرِ فن اپنی خوش بیانی کا سکہ بٹھا سکتا ہے۔ تو بلاشبہ اس کی کوشش اور محنت کی وقعت ناقدانِ سخن کے نزدیک بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور ہر شخص اس مصنف

کی سعی بلیغ کی داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اتنی تمہید عرض کر چکنے کے بعد اب ہم کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حضرت نوح کے نوادر افکار میں حمد و نعت منقبت، سلام، قطعہ رباعی، مثنوی مرثیہ اور غزل ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ مگر زیادہ تر غزل کہتے لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعہ غزلیات دوسری قسم کے کلام کے مقابلے میں بہت زیادہ اور ضخیم ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ نظم کی کسی صنف سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے مزید ثبوت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی طبیعت ہر قسم کا کلام لکھنے پر حاکمانہ قدرت رکھتی ہو۔ بہت سے شاعر ایسے تھے اور ایسے ہیں کہ نظم کی ایک صنف تو خوب لکھتے ہیں مگر دوسری صنف میں ان کا قلم شکستہ پا دکھائی دیتا ہے۔ ناسخ مرحوم غزل گوئی میں اتنے نامور اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ مگر مثنوی مصالح اعضائے انسانی ان کی شان کے منافی اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ زمانہ حال کے بہت سے مشہور اور مشاق غزل گو ایسے ہیں کہ غزل کے سوا اور کوئی تقریبی یا ہنگامی عنوان ہو یا ملکی و قومی رنگ میں کچھ لکھنا ہو تو یا تو لکھ ہی نہیں سکتے اور اگر لکھتے ہیں تو بہت ہی معمولی اور پھیکا لکھتے ہیں۔ مگر حضرت نوح کے کلام میں نظم کی ہر ایک صنف موجود ہے اور ہر صنف میں ان کی طبیعت کا رنگ یکساں ہے۔ ان کے کلام کی متعدد خصوصیتیں آگے چل کر بیان کی جائیں گی قطعہ، رباعی، حمد، نعت، سلام، مرثیہ وغیرہ سب میں یہ خصوصیتیں

اپنی پوری قوت سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ خوش بیانی اور استادانہ بندش کا رشتہ کہیں ان کے ہاتھ سے نہیں جاتا جو جزو کچھ کہتے ہیں۔ ایک رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کے سلام اور مرثیے ان کے ظریفانہ کلام کے بالمقابل رکھ کر پڑھے جائیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنا درد بھرا کلام لکھنے والا شخص ہنسی ٹھٹھول کے ایسے مضامین کہاں سے نکال سکتا ہے۔

چونکہ کلام کا بڑا مجموعہ غزلیات کی صورت میں ہے۔ اس لیے پہلے غزل ہی پر بحث کی جاتی ہے۔ اس وقت کے کئی نمونے دنیائے ادب کے سامنے ہیں۔ ایک تو وہ رنگ ہے جس میں حضرت داغ یا امیر نے قبولیت عام و شہرت دوام حاصل کی۔ ان دونوں باکمالوں کے شاگرد اسی رنگ کے شیدائی ہیں۔ دوسرا رنگ وہ ہے جس میں درد اور یاس کے سوا تیسری چیز نہیں ہے۔ اس قسم کی غزل شہرت کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ سرتاپا مرثیہ ہے۔ جس کو غزل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ رنگ سے افسردگی بیزاری اور زار نالی کے سوا کوئی ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا۔ جسے زندگی بخش کہا جا سکے۔ حالاں کہ ملکی اور جماعتی ضروریات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ شاعری تمام افراد ملک کے لیے حیات افروز ہو۔ اگر اس سے شگفتگی اور زندگی حاصل نہیں ہوتی تو جمہور کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس نظریہ کے مطابق اگر غزل کی جانچ کی جائے تو حضرت داغ کی غزل سب سے بہتر نمونہ تسلیم کی جائے گی۔ تیسرا رنگ وہ ہے

جس میں صرف زبان ہی زبان ہے اور تخییل کو اس میں بہت کم دخل ہے
یہ رنگ زبان کی خدمت گذاری کے لیے تو بیشک مفید ہے مگر
تخییل کے نہ ہونے سے شاعرانہ کمال میں شمار نہیں ہو سکتا۔
زبان کی خوبی آرائش و زینت کا سامان ہوا کرتی ہے اگر زینت پانے
والے (شاہد معنی) ہی کا وجود نہ ہو تو یہ سامان زینت کس کے
لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرز کو صرف باتیں ہی باتیں کہا جاتا
ہے۔ مثلاً۔

تمہیں چاہو تمہیں چاہو، تمہیں چاہو رقیبوں کو
کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

چوتھا رنگ فلسفیانہ و حکیمانہ ہے۔ افراد ملک کے لیے یہ رنگ
مفید بھی ہے بشرطیکہ بیان کی صفائی بھی اس کے ساتھ شامل حال
ہو مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ شعر
کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور غزل معمہ بن کر رہ جائے اس کے علاوہ
ایک اور خرابی اس طرز میں مستزاد ہو رہی ہے وہ یہ کہ غیر متعارف
الفاظ دور دور کے استعارے اور عجیب عجیب فارسی ترکیبیں جن
میں غرابت کا عیب پایا جاتا ہے نہایت کثرت سے استعمال میں آ رہی
ہیں، اس لیے جب تک یہ عیب موجود ہیں اس وقت تک اس
قسم کی غزل چنداں سودمند نہیں ہو سکتی۔ پانچواں رنگ وہ ہے
جس میں ملکی قومی۔ تاریخی اخلاقی اور سبق آموز ظریفانہ مضامین غزل
کی طرز میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی غزل کو غزل کہنا درست
نہیں۔ کیونکہ تغزل کی کوئی بات اس میں نہیں ہوتی۔ یہ پانچوں نمونے

مختلف طرز کے اس وقت ملک میں مروج ہیں جن میں ایک مشترکہ خوبی یہ ہے کہ تہذیب جدید کے اثر سے بالکل عریاں اور حیا سوز مضامین ہر قسم کی غزل سے مفقود ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ زمانے کے مذاق نے ایسی خرافات کو قابل نفرت اور آداب محفل سے خارج قرار دیا ہے حضرت نوحؔ کی غزل میں کبھی یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ کسی قسم کے برہنہ مضامین جن کا وجود دورِ آخر کے تمام شعرا کے کلام میں کم و بیش موجود تھا ان کی غزل میں نہیں پائے جاتے۔

مذکورہ بالا قسم کی پانچوں غزلیں اگر ایک جگہ رکھی جائیں اور غزل کی تعریف جو فنی کتابوں میں درج ہے اس کے لحاظ سے اچھی غزل کا انتخاب کیا جائے تو ہمارے خیال میں وہ غزل انتخاب میں آئے گی جو پہلی قسم کے رنگ میں لکھی گئی ہے حضرت نوحؔ کی غزل بھی اسی رنگ کی نمایندگی کرتی ہے۔ جس کو پڑھ کر افسردگی یا بیزاری پیدا نہیں ہوتی بلکہ شگفتگی اور زندگی کا ایک دریا اپنی موج میں بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زبان نہایت شیریں اور شستہ اس پر سلیس اور عام فہم اتنی کہ ہر شخص سمجھ سکے۔ بیان اس قدر صاف اور سلجھا ہوا کہ شعر پڑھا اور دل میں اترا۔ بندشیں اتنی کٹھوس کہ کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔ حشو و زوائد کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ مضامین اتنے بلند تازہ اور دلکش گویا معنی کے آسمان پر بے شمار نورانی صورتیں اپنے جہان آرا جمال کے جلوے دکھا رہی ہیں۔ اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ آنکھوں

والو ذرا ادھر دیکھو اِن جلووں کو ایک نظر دیکھو اگر ہوش باقی رہ جائے تو پھر بتانا کہ ہم کیا چیز ہیں۔

مناسب یہ تھا کہ اس مقام پر کم سے کم تین چار سالم غزلیں نقل کی جائیں مگر ایک تو حضرت نوحؔ کی غزل عموماً لمبی ہوتی ہے وہ اپنی پُرگوئی کے تقاضے سے جب تک پندرہ بیس بلکہ بعض حالتوں میں اس سے زیادہ شعر نہ لکھ لیں اور غزل کی زمین کو اپنی گرم رفتاری سے اچھی طرح پامال نہ کر ڈالیں اِن کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اس مضمون کی طوالت کا خوف بھی دامن گیر ہے۔ اس لئے صرف ایک غزل جو مختصر بھی ہے۔ بطور نمونہ یہاں سالم درج کی جاتی ہے۔ تاکہ اصل ذوق غزل کی مجموعی نوعیت کا اندازہ کر سکیں۔ اس کے بعد محاسن کلام کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

غزل

دل ملا کر دل کو وہ کرتا ہے کیوں دل سے الگ
ہوں گے دِقت سے جدا اب ہوں گے مشکل سے الگ

درد و غم ارباب نہیں ہوتے کبھی دل سے الگ
یہ بھری محفل مری ہے ان کی محفل سے الگ

رہ گیا بس اب اسی پہ پر زندگی کا آسرا
ہم کریں پہلو سے دل کو اپنے کس دل سے الگ

شمع کے سر پہ بھی مصیبت آئی پروانے کے ساتھ
کر دیا دونوں کو اس نے اپنی محفل سے الگ

پہلے دو بچھڑے ہوئے آپس میں ملتے ہی نہیں
پھر جو مل جاتے ہیں تو ہوتے ہیں مشکل سے الگ

عشق میں تقدیر نے ڈالا یہ کیسا تفرقہ
دل ہُوا مجھ سے جدا میں ہوگیا دل سے الگ

پہلے اس کو دیکھ پھر اے قیس اپنے دل کو دیکھ
ایک محمل اور ہے لیلیٰ کے محمل سے الگ

روز و شب رہتا ہے مجھ کو دھیان بزم ناز کا
ان کی محفل میں ہوں لیکن اہلِ محفل سے الگ

یہ تو اے سفاک تیرے عہد میں ممکن نہیں
تیغ گردن سے جدا ہو تیر ہو دل سے الگ

کیا انہیں طوفان کا ڈر کیا انہیں موجوں کا خوف
نوحؔ بحرِ عشق میں رہتے ہیں ساحل سے الگ

اکثر جوہریانِ سخن اور کاملانِ فن نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہر غزل میں اچھے اشعار کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ہوتی. باقی تمام اشعار بھرتی کے ہوتے ہیں۔ یہی دو تین اچھے شعر غزل کو لے اڑتے ہیں۔ اس قول کو ذہن میں رکھ کر مذکورہ بالا غزل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر ایک شعر لطف زبان و حسن بیان کی دولت سے مالا مال ہے اور اس میں تغزل کی وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود ہیں. جو ایک باکمال استاد کے کلام میں ہوا کرتی ہیں۔

محاسن کلام

جس طرح ہر استاد کے کلام میں چند باتیں امتیازی حیثیت کی ہوتی ہیں حضرت نوح کے کلام میں بھی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو انہیں اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہیں۔ یہ جملہ محاسن ان کے تمام مجموعہ کلام میں اپنی جھلک دکھا رہے ہیں۔ ان خصوصیتوں کی کچھ تفصیل بھی سنیئے۔

پہلا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کا کلام اتنا سلیس اور عام فہم ہے کہ پڑھتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔ پیچیدہ بیانی اور دشوار پسندی کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔ اس وصف کو استادان سلف کے بعد حضرت داغؔ نے بہت نمایاں کیا تھا۔ اور یہ کہنا بالکل بے مبالغہ ہے کہ حضرت نوحؔ نے اس وصف کو اتنی ترقی دی ہے کہ کلام کا اس سے زیادہ عام فہم اور سلیس ہونا بالکل غیر یقینی دکھائی دیتا ہے۔ تخیل کو ہاتھ سے چھوڑ کر صرف زبان ہی زبان کو سرمایہ شاعری سمجھ لیا جائے تو شاید اس سے زیادہ ترقی کی گنجائش نکل سکے لیکن تخیل اور زبان کو ساتھ ساتھ رکھا جائے تو سلاست کا یہ خاص وصف منتہائے کمال ہے۔ بعض لوگ کمال شاعری کا معیار یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف خواص ہی اس کو سمجھیں اور عوام کے لیے اس کا سمجھنا لوہے کے چنے کے مصداق ہو۔ انہیں لوگوں کا یہ قول ہے کہ حضرت داغؔ کے انداز سخن گوئی نے شاعری کو بہت آسان کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اسی پہ

دو زبردست اعتراض عائد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر ملک اور قوم میں حیات تازہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کا زندگی بخش کلام ایک قلیل التعداد جماعت تک جسے خواص سے تعبیر کیا جاتا ہے کیوں محدود رہے۔ کیا ملک اور قوم کے کثیر التعداد افراد اس کے حیات افروز افکار سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ وہ بلاشبہ یہ حق رکھتے ہیں اور ہمارے خیال میں سب سے زیادہ حقدار وہی ہیں۔ کیوں کہ عوام ہی اس نئی زندگی کے محتاج ہوتے ہیں۔ ـــــــــ پس ایک خوش بیان شاعر اگر گونگے کی فارسی لکھتا چلا جاتا ہے تو اس سے عوام کو کیا فایدہ پہنچ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کلام کا عام فہم ہونا بذات خود کمال شاعری ہے۔ اسے شاعری کو آسان بنا دینا کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ یہ وصف تو درحقیقت ایک دشوار کام ہے۔ مشکل سے مشکل دقیق سے دقیق اور نازک سے نازک مضامین جو نثر میں بیان کرنا چاہیں تو کئی سطروں میں بیان ہو سکیں۔ اگر کوئی چھوٹی سی بحر میں چند گنتی کے الفاظ استعمال کرنے سے بخوبی ظاہر ہو جائیں تو یہی کچھ کم خوبی کی بات نہیں خواہ اِن الفاظ میں چیدہ چیدہ استعارے اور مسلسل اضافتوں کو بھی استعمال نہ کیا ہو اور مضمون کو نہایت سلیس اور عام فہم رنگ میں بڑی وضاحت و صراحت سے بیان کر دیا ہو تو اس سے زیادہ کمال شاعری اور کیا ہو سکتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے دلِ زار وہ آتے ہیں عیادت کے لیے

اب سنبھلنا ہی پڑے سنبھل ہم کو

دل زار کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اور کوئی غمخوار موجود نہیں۔ بالکل بے کسی کا عالم ہے۔ لفظ سنبھلنا سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریض کا حال کس قدر غیر ہے۔ سنبھلنا ہی پڑا ان الفاظ سے جو مجبوریاں ظاہر ہوتی ہیں ان کی تشریح دو چار سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک دریا ہے جو تین لفظوں کے کوزے میں بند ہے۔ کیوں سنبھلنا پڑا اس کی وجہ مصرعہ اوّل میں بیان کی گئی ہے۔ مگر یہ وجہ محض ظاہری ہے۔ اصل وجہ کو ناقابل اظہار سمجھ کر پردہ راز میں رکھا گیا ہے۔ اب یہ سخن فہموں کا کام ہے کہ اس راز کو ٹٹولیں کہ وہ عیادت کو آتے ہیں تو سنبھلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی۔ یہ اخفا اس شعر میں نہایت دل چسپ ہے اور اس میں بہت سے مطالب پوشیدہ ہیں۔ علاوہ اس کے شعر کی ظاہری صورت کس قدر صاف اور دلکش ہے۔ سنبھلنا اور سنبھالا کا لطف دیکھیے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔

غور سے دیکھ ذرا او دلِ مشتاقِ جمال
طور پر کچھ نظر آتا ہے اجالا ہم کو

مشتاق جمال کو جلوہ جمال کہیں نظر نہیں آتا وہ اس کی تلاش میں سرگرداں و حیران ہو رہا ہے اگر تھوڑی سی جھلک کہیں دکھائی دے جاتی ہے تو بھی اس کو یقین نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایسے نصیب کہاں اس لیے غور سے دیکھنے کی تاکید کرتا ہے کہ او دل مشتاق جمال طور پر کچھ اُجالا دکھائی دے

رہا ہے۔ اِسے غور سے دیکھ کہ آیا یہ اسی محبوب کا جلوہ ہے یا کچھ اور ہے۔ لفظ غور اس شعر میں بہت استادانہ اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

لڑکھڑا کر کبھی قدموں پہ جو ساقی کے گرے
پھینک کر جام سبو اس نے سنبھالا ہم کو
آج تک کیوں نہ خبر لی نہ خبر لی تم نے
آج تک کیوں نہ سنبھالا نہ سنبھالا ہم کو

پہلے شعر میں لڑکھڑانے کی وجہ لفظ ساقی اور جام و سبو سے ظاہر ہے۔ اس کو ظاہر کرنا بھی بلاغت کا حق ادا کرنا ہے لفظ کبھی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی پی جائے۔ جس سے بالکل بدمست ہو جاتے ہیں۔ یہ لغزش کبھی کبھی ہوا کرتی ہے مگر اس عالم میں بھی اتنا ہوش باقی رہتا ہے کہ گرتے ہیں تو ساقی کے قدموں پر گرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مصرعے میں ساقی کے التفات کو واضح کیا گیا ہے۔ مضمون کا یہ حصہ بہت پر لطف ہے اس میں محاکات کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ پھینک کر جام و سبو یہ الفاظ اس کوشش کی نہایت روشن تصویر ہیں۔ یعنی ساقی نے اس قدر عجلت سے کام لیا اور اس قدر التفات کا ثبوت دیا کہ جام و سبو کی جو اس کی عظمت کا سرمایہ تھے مطلق پرواہ نہ کی انہیں فوراً پھینک دیا اور سنبھالنے پر آمادہ ہوا۔

دوسرے شعر میں لفظ آج تک سے جو طویل مصیبت ظاہر ہو رہی ہے اس کے ساتھ شکایت کی تکرار اور وہ بھی دونوں مصرعوں

ہیں تقابل کے ساتھ کیا مزا دے رہی ہے۔

جس کی حد حبس کی ہو کچھ میعاد بھی
وہ گرفتاری گرفتاری نہیں

کنایتاً اپنی طویل گرفتاری حبس سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں اس شعر میں بیان کی گئی ہے اور یہ اسلوب بیان بہت نادر ہے۔ شعر سراپا شعریت ہے۔ محبت میں گرفتار ہو کر آزادی کہاں۔ اگر کچھ عرصے کے بعد آزادی مل گئی ہے۔ تو وہ عشق ہی نہیں بلکہ محض مطلب براری ہے۔ ایسی گرفتاری کو گرفتاری عشق نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے مصرع کے آخر میں لفظ " بلکہ مطلب براری ہے " کو محذوب سمجھنا چاہیئے یہ حذف حسن بیان میں شامل ہے۔

پہلے تم نے دِل لیا پھر تم نے میری جان لی
بعد اس کے یہ کیا اب کیا کروگے اس کے بعد

بعد اس کے یہ کیا اس کی تشریح مصلحتاً نہیں کی گئی کیوں کہ درحقیقت وہ ناگفتنی ہے یہ ایک ایسی مصیبت ہے جو جان لینے سے بھی زیادہ تباہ کن اور قتل کرنے سے بھی زیادہ جابرانہ ہے۔ اس حد تک بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ باین ہمہ یہ یقین ہے کہ ابھی اس جور و ستم کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے پوچھا ہے کہ اب کیا کروگے اس کے بعد اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کون سی آفت برپا کروگے اور دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اب اس سے زیادہ سختی اور کیا کروگے۔

یہ چند مثالیں اس غرض سے پیش کی گئی ہیں کہ نازک سے

نازک مضامین کو جن کی شرح کی سطروں میں ہوتی ہے۔ ایک شعر میں بیان کر دینا اور وہ بھی اتنے عام فہم اتنے سلیس اور صاف پیرائے میں جس سے زیادہ صاف پہلو خیال میں نہیں آ سکتا۔ فی الواقع کمالِ شاعری کا ثبوت ہے۔ اس خصوصیت سے متعلق زیادہ مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ حضرت نوحؔ کا کلام اس نعمت سے مالا مال ہے۔ یہاں تک کہ تمام مجموعہ کلام میں ایک شعر بھی ایسا نظر نہیں آتا جو عام فہم اور سلیس نہ ہو۔

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نوحؔ کا کلام تصنّع اور آورد سے قطعاً پاک ہے اور اس سے ان کی مشقِ سخن اور مہارت تامہ کا ثبوت ملتا ہے۔ تصنّع اور آورد کا رنگ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک لفظی دوسرے معنوی۔ آورد وہ ہے کہ ایک بے تکے مضمون کو تکلف کے ساتھ مربوط کر لیا جائے لفظی آورد وہ ہے کہ عجیب و غریب قسم کے الفاظ اور ترکیبیں اور زوائید جمع کر دیئے جائیں جن سے ایک سیدھا مضمون الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جائے یا نامناسبات اور بے ضرورت مترادفات ایک مصرعے میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ جیسا کہ امانت کے واسوخت میں ہے۔ مشاق اور ماہر فن دونوں قسم کے نقائص کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور خود کبھی اس خبط میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وجہ یہ ہے ذوقِ سخن اس قسم کے کلام کو قبول کرنے سے اباء انکار کرتا ہے ان کی زبان سے لفظ بہت۔ جچے تلے باون تولے پاؤ رتی نکلتے ہیں۔ جو اپنی کم سے کم تعداد میں تمام مضامین پر حاوی ہوتے ہیں مصرع پر مصرع ایسا لگاتے ہیں کہ اس سے بہتر

۔ اور واضح صورت خیال میں نہیں آسکتی اور اس میں ایک لفظ کی ترمیم کی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً مصرع ذیل۔

ایک فہرست میرے پاس ہے ویرانوں کی

کسی شاعر کو دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کی تضمین کر دو تو اسے محسوس ہوگا کہ اس پر مصرع لگانا اور اس میں ربط پیدا کرنا آسان نہیں ۔ مگر حضرت نوح بے ساختہ کہہ دیتے ہیں ۔

جوشِ وحشت میں کسی سمت نکل جاؤں گا
ایک فہرست میرے پاس ہے ویرانوں کی

یا ذیل کے مصرع پہ ——۔

دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے

مصرع لگانا ہو تو ہر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ کس طرح دل لگانے میں محض دل لگی پائی جاتی ہے ۔ دور دور تک خیال دوڑائیں گے ۔ یہاں تک کہ مجنوں اور فرہاد کی قبر پر بھی خاک چھانیں گے ۔ مگر حضرت نوح دور نہیں جاتے بے ساختہ بول اُٹھتے ہیں ۔

جس نے شیدائی بنایا اس کے شیدائی بنے
دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے

دیکھئے یہ مصرع کس قدر چسپت اور کتنا مربوط ہے ۔ اس سے بہتر اور کوئی مصرع خیال میں نہیں آسکتا ۔

(۳) تیسری خصوصیت الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے تعلق رکھتی ہے یہ تقدیم و تاخیر شعر میں ناگزیر ہے ۔ مگر اتنی نہیں ہونی چاہیئے کہ تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو جائے ۔ حضرت نوح ناروی نے الفاظ

کی تقدیم و تاخیر حیرت انگیز حد تک کم کر دی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد جن کی نثر نہ بن سکے اور جنہیں سہل ممتنع کہا جا سکے اس قدر زیادہ ہے کہ کسی اُستاد کے کلام میں ایسے اشعار اتنی کثیر تعداد میں زیادہ نہ ہوں گے۔ مثلاً۔

فلک کے پار ہوتی ہے کلیجے میں اترتی ہے
ہماری ایک اک فریاد دو دو کام کرتی ہے

ہمارا دل ہو یا ان کی زباں دونوں ہی آفت ہیں
یہ سب کچھ کر گذرتا ہے وہ سب کچھ کہ گذرتی ہے

مری تدبیر نے مجھ کو مری تقدیر پر ٹالا
مگر اب دیکھئے تقدیر کیا تدبیر کرتی ہے

* * *

حسنِ روز افزوں جو پردے سے عیاں ہو جائے گا
ایک ہم کیا ہیں فدا سارا جہاں ہو جائے گا

چرخ کی نامہربانی بھی مزا دے جائے گی
کوئی اس کی ضد سے مجھ پر مہرباں ہو جائے گا

ہم کو اپنے عشق کے اظہار کی عادت نہیں
بے کہے یہ خود بخود ان پر عیاں ہو جائے گا

(۴) چوتھی خصوصیت جو حضرت نوح کو تمام شعرائے حال و ماضی سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی زبان اور روزمرہ ہے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اُردو زبان کو ہندوستان میں اگر عام قبولیت ہو سکتی ہے تو صرف اسی صورت میں کہ اس میں فارسیت کا عنصر جس

حد تک بھی کم ہو سکے کم کر دیا جائے اور نظم و نثر دونوں میں اس قدر سلیس اور عام فہم لکھا جائے، کہ اس کا سننا اور سمجھنا کسی قسم کی دشواری پیدا نہ کرے۔ جن شعراء نے اس اصول کو مدنظر رکھا ہے ان کا کلام بے حد مقبول ہوا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جس کلام میں بڑے بڑے فارسی لغت اور مسلسل ترکیبیں داخل کی گئی ہوں وہ زبان پر نہیں چڑھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی زبان بول چال کے خلاف ہوتی ہے۔ فصحا اپنی معمولی گفتگو میں جس قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں وہی بے تکلفانہ رنگ شاعرانہ انداز کے ساتھ کلام میں بھی قائم رکھا جائے تو وہ بہت پُرلطف معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ زبان کے لحاظ سے ان نیچرل (غیر قدرتی) ہو جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حضرت داغؔ نے اس ضرورت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور اپنے کلام کی بنیاد اسی اُصول پر قائم کی۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے مقدور کے مطابق ان کی پیروی کی مگر پیروی پیروی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور مراتب کا اختلاف بھی لازمی امر ہے۔ حضرت نوحؔ نے اس اصول کی پیروی میں کمال کر دیا ہے۔ اُنہوں نے متروکات کی نہایت سختی سے پابندی کی اور ان کے علاوہ مختلف قسم کے جدید متروکات بھی وضع کیے ہیں۔ فارسی عطف و انتہائی حد تک اُڑا دیا ہے آج کل کئی نامور شعراء صحت زبان کے مدعی ہیں مگر ہم ان کے کلام میں فارسی کے حروف جار اور دوسرے فارسی الفاظ خالص فارسیت کے رنگ میں موجود پائے جاتے ہیں۔ قوانی عطف قوانی، اضافت اور دوسری فارسی ترکیبیں مثلاً "تا مردن" "پس از مرگ" "شرر آسا" "شعلہ سان"

تابہ خانہ تابہ فلک وغیرہ بے دھڑک استعمال ہو رہے ہیں۔ ان کے علاوہ عجیب عجیب فارسی ترکیبیں تراشی جا رہی ہیں اور ان کو استعمال کرنے والے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ گویا بڑی مہم ماری ہے۔ مثلاً نوا زار کیف زار، ھنوستان نواریز، کیف ریز وغیرہ۔ زار اور ستان کی خوب مٹی خراب ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ دہلی و لکھنؤ کے بعض شعراء کلام کو عام افہام سے بالاتر بنانے کی مشق میں مصروف ہیں اور اسے اُردو شاعری کے اوج ترقی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کا مفہوم بہت محدود ہوتا ہے۔ پیچیدہ بیانی کی وجہ سے اسے پڑھ کر گونگے کے گڑ کی طرح دل ہی دل میں مزے لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے مصنف زبان کی کوئی خاص خدمت نہیں کر رہے۔

پس صحت کے لحاظ سے جن شعراء کو صحیح معنوں میں زبان کا خادم کہنا چاہیے ان کی تعداد نہایت قلیل ہے اور اس قلیل تعداد میں حضرت نوحؔ کو جو فوقیت حاصل ہے وہ اس قدر لاثانی ہے کہ اس خاص وصف میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں۔ اور تو اور دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے کلام میں بھی زبان کا وہ بے ساختہ رنگ اتنی نمایاں صُورت میں نہیں پایا جاتا۔ جو حضرت نوحؔ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ حضرت داغؔ نے خدمت زبان کا جو مشن شروع کیا تھا حضرت نوحؔ نے اس مشن کو حدِّ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ ان کا کلام اُردو زبان کی نہایت صحیح گرامر اور روزمرّہ کا نہایت پاکیزہ و شستہ نمونہ ہے۔ اس اظہار کمال کے باوجود اُنہوں نے

تخیل کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ دقیق سے دقیق مضامین کو اس قدر صفائی و سلاست سے زبان اور روزمرّہ کی پابندی قائم رکھ کر بیان کر جاتے ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ سننے والا سنتا ہے اور سر دھنتا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو کسی کی ادا پہ فدا نہ ہوا جو کسی کی ادا پہ فدا نہ رہا
وہ تو دل ہی نہیں وہ جگر ہی نہیں وہ پہ نہ ہے وہ رہا نہ رہا

جو وہ غم نہ رہا تو وہ دل نہ رہا جو وہ دل نہ رہا تو وہ ہم نہ رہے
جو وہ ہم نہ رہے تو وہ تم نہ رہے جو وہ تم نہ رہے تو مزا نہ رہا

مرے ذہن میں ہے مرے ہوش میں ہے مری عقل میں ہے مری یاد میں ہے
وہ الگ بھی ہوا تو الگ نہ ہوا وہ جدا بھی رہا تو جدا نہ رہا

تینوں شعروں میں زبان کا جو رنگ دکھائی دیتا ہے وہ ہمارے دعوے کا نہایت روشن ثبوت ہے۔ پہلے شعر میں فدا نہ ہوا اور نہ فدا رہا کا معنوی فرق ظاہر کیا ہے۔ اس قسم کے نکات حضرت نوح نے جابجا حل کیے ہیں۔ مصرع ثانی میں زور کلام کا جو نمونہ نظر آتا ہے وہ نہایت لاثانی ہے پھر فیصلہ کی شان دیکھیے۔ کس درجہ ناطق اور کس حد تک قطعی ہے۔

تیسرے شعر میں اپنی یادداشت کو کس زور سے بیان کیا ہے مصرع اوّل کی ساخت دیکھ کر حیرت پیدا ہوتی ہے۔ اس یادداشت کا مضمون کیا ہے وہ مصرع ثانی میں بیان کیا گیا ہے جو بجائے خود نہایت رقیق اور نہایت پیچیدہ روحانی مسئلہ ہے۔ وہ الگ بھی ہوا تو الگ نہ ہوا اور رہا کا فرق یہاں نمایاں ہے۔

دوسرا شعر ایک غیر فانی ادبی شاہکار ہے۔ اتنے چھوٹے چھوٹے لفظوں سے جو یا تو دو حرفی ہیں یا سہ حرفی۔ اتنا بڑا کام آج تک کسی نے نہ لیا ہوگا۔ سلسلہ کلام کی کڑی ایک دوسرے سے اس طرح ملتی جلتی ہے کہ ربط کلام کا یہ نمونہ ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ چاروں ٹکڑوں میں سے ہر ایک ٹکڑا بجائے خود ایک مضمون ہے اور ہر ایک تشریح کے لیے بہت سی قوت بیانیہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ غم محبت کے بغیر لہو کی بوند کے سوا کچھ نہیں اور جب دل اس قدر حقیر و بے مایہ ہو جائے تو انسان کی حقیقت بھی حقیر و بے مایہ ہو جانا مطلوب کی شان کو بٹہ لگاتا ہے۔ بقول مرزا غالب۔

اگر نہ بہر من از بہرِ خود عزیزم دار
کہ بندہ خوبی او خوبیِ خداوند است

اور جب مطلوب کی شان ہماری رسوائی اور بے مائیگی کی وجہ سے کم ہو جائے تو یہ ندامت اور بھی سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس قرار اور رقیق روحانی مسائل کو ایسی حیرت انگیز سادگی سے بیان کرنا جانا اور اس میں بھی زبان کا یہ رنگ بھر دینا ثابت کرتا ہے کہ اس سے زیادہ کمال شاعری کا اظہار دشوار ہے۔

وہ کرم وہ لطف کدھر گیا وہ خوشی کا وقت گذر گیا
انہیں اب نہیں جو ملال بھی مجھے ایک یہ بھی ملال ہے

کوئی آرزو نہ نکل سکی کبھی شکلِ غم نہ بدل سکی
جو امید تھی وہ امید ہے جو خیال تھا وہ خیال ہے

عمری بمبئی

وہ ہجوم ظلم و جفا ہے اب وہ نزول قہر و بلا ہے اب
مجھے چار روز کی زندگی تیری آرزو میں محال ہے

نہ وہ آئیں گے نہ بلائیں گے یونہی جان لیں گے ستائیں گے
نہیں اور دھن ہے نہ دھن ہوتی مرے دل کو اور خیال ہے

پہلے شعر میں ملال نہ ہونے کا ملال، حسن بیان کی نزاکت کو ظاہر کرتا ہے غالب بھی کہہ گئے ہیں۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دوسرے شعر کا مصرع اوّل حسرت و یاس کی مجسم تصویر ہے جس کا اثر دوسرے مصرع کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو اُمید تھی وہ امید ہے جو خیال تھا وہ خیال ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اصلی صورت میں وہی کا وہی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ محض خواب و خیال اور بے اصل ہے۔ حسن بیان اور یہ سادگی بقول مولانا حالی۔

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھکول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

تیسرے شعر میں بھی وہی صنعت توسیع موجود ہے جو ہر ایک شعر کے مصرع اوّل میں پائی جاتی ہے۔ کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے لفظ " وہ " کافی تھا۔ مگر اظہار محبت کی تکرار نے اس زور کو دوچند کر دیا ہے۔ مصرع ثانی میں زندگی کو چار روز کی زندگی کہنا بالکل اُستادانہ طرز بیان ہے۔ چار روز نے مصرع کے

ظاہر و باطن دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ چوتھے شعر میں دھن اور خیال کی صراحت نہیں کی گئی۔ اگر یہ اخفا ہے تو عین مصلحت ہے۔ ورنہ روز مرہ بھی یہی ہے۔ اور اس محل پر یہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ وہ اور دھن میں ہیں۔ اور خیال میں ہو اپنے لیے خیال اور ان کے لیے دھن کہنا بھی نکتہ پروری ہے۔

پہلے میرا حال سُن پھر سن کے میرا حال دیکھ
دیکھ کر پھر غور کر پھر غور کر کے دل سے پوچھ

یہ تغافل ہے بُرا یہ بے رُخی اچھی نہیں
رنج دل کا درد دل کا حال دل کا دل سے پوچھ

پہلے شعر کی ساخت اور اس مضمون کو سلسلہ در سلسلہ دیکھ کر حیرت پیدا ہوتی ہے معاملہ کی بات کس خوبی سے کہی ہے۔ یہ اسلوب یہاں بہت نادر الوجود ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا ارشاد کیا ہے۔ اور کس قدر بجا فرمایا ہے۔ ظاہری ہمدردی سے کیا ہوتا ہے۔ کیفیت تو سُنی نہیں پہلے وہ سن لو پھر اس کی صداقت کا امتحان لو اور اس مصیبت کا اندازہ کرو پھر اس کی وجوہ پر غور کرو اور اپنے دل سے پُوچھو تو معلوم ہوگا کہ ——

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

دوسرے شعر میں قافیہ کی بندش کس قدر مرغوب ہے دل سے پوچھ یعنی سچے دل سے پوچھ ورنہ یہ ظاہری اور اوپری ہمدردی مجھے کچھ فائدہ مند نہیں ہو سکتی۔ مصرع ثانی میں رنج دل کا درد دل کا حال دل کا ان الفاظ کی تکرار سے جو زور پیدا

ہوا ہے وہ ظاہر ہے۔
اس ضمن میں صدہا مثالیں یہاں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان کے لحاظ سے حضرت نوح کا پایہ سخن کس قدر بلند ہے۔ طول کلام کے خوف سے صرف چند مثالیں بغیر کسی مزید تشریح کے اور درج کی جاتی ہیں۔

کوئی کیوں اس پہ عاشق ہو کیوں اس کا شیدا ہو
کسے معلوم کس کا تھا وہ کس کا ہے وہ کس کا ہے

＊ ＊

گذرتی ہے بشر کی زندگی کس کس توہم سے
جو ایسا ہو تو ایسا ہو جو ایسا ہو تو ایسا ہو
تمہارے وعدۂ فردا پہ کیوں کر اعتبار آئے
کبھی کچھ ہو کبھی کچھ کبھی کیا ہو کبھی کیا ہو

＊ ＊

مرا دل لے کے مجھ کو غم ترا بے انتہا دینا
یہ کیا باتیں ہیں کیا گھاتیں ہیں کیا لینا ہے کیا دینا
وہ اے قاصد بھلا کب ان تری باتوں میں آتے ہیں
بہت دشوار ہے ملنا بلا لینا ملا دینا

بعض اصحاب ان تری باتوں کی جگہ تیری باتوں لکھتے ہیں۔ مگر حضرت نوح اس محل پہ ضمیر مضاف الیہ کو مضاف سے ملحق رکھتے ہیں۔ مصرع ثانی میں ملنا۔ ملا لینا ملا دینا کا فرق ملاحظہ فرمائیے۔

کہاں شمشیر کا دم خم کہاں خونِ دلِ عاشق
اسے تلوار پر دیکھا اسے تلوار نے دیکھا

دو مختلف چیزوں میں فرق بیان کرنے کے لیے یہ طریق استدلال بالکل نرالا اور نیا ہے۔ جس میں زبان کے نکات حل کیے ہیں۔ تلوار کا دم خم تلوار میں ہوتا ہے اور خون دل عاشق تلوار پر ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں چیزیں بالکل مختلف ہیں۔ دم خم کی خوبی کتنی وجدانی ہے۔

آپ کے انداز کر چکتے مجھے اب تک ہلاک
وہ تو کہیے غیب سے میری کمک ہوتی رہی

کیا کہیں ہم کہہ سکے پھر بھی نہ اپنے دل کی بات
گفتگو ہونے کو ان سے دیر تک ہوتی رہی

پہلے شعر میں "وہ تو کہیے" یہ روزمرہ کس بے تکلفی سے نظم ہوا ہے۔ دوسرے شعر میں رکن صدر بہ لحاظ مضمون باقی شعر سے کتنی مناسبت رکھتا ہے۔ اسی شعر کے مصرع ثانی کی زبان اور اس کی بے تکلفی دیکھیے۔

کسی کو بیٹھ کر ہم نے یہاں اٹھتے نہیں دیکھا
اگر اٹھتا ہے تو فتنہ تری محفل سے اٹھتا ہے

وہاں سے جو نکلتا ہے نکل جاتا ہے دم اس کا
وہ اٹھ جاتا ہے دنیا سے جو اس محفل سے اٹھتا ہے

یہ حیرت ہم کو ہوتی ہے تمہارے ناز بے جا پر
جو دنیا سے نہیں اٹھتا وہ کیوں کر دل سے اٹھتا ہے

جوان کی سرگزشت بارِ غم تحریر کرتا ہوں
تو میرے خط کا اک اک لفظ بھی مشکل سے اُٹھتا ہے

اس زمین کو دیکھیے اور پھر ہر شعر میں ردیف کی نشست ملاحظ کیجیے۔ آخری شعر میں بارِ غم یہ ٹکڑا کتنا ضروری اور اُستادانہ شان کا ہے۔ ایسی زمین میں یہ خوش بیانی آسان نہیں۔

(۵) پانچویں خصوصیت لفظوں کا اُلٹ پھیر ہے۔ جو شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیتا ہے۔ بادی النظر میں شاید اسے معمولی بات سمجھا جائے مگر معمولی بات میں بھی سلیقہ درکار ہے اور یہی سلیقہ ہے جو اس خصوصیت کے تحت میں ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس الٹ پھیر سے اگر معانی میں اختلاف یا تنوع پیدا نہیں ہوتا اور مضمون وہی کا وہی رہتا ہے تو یہ الٹ پھیر کسی کمال میں شمار نہیں ہو سکتا بلکہ شاید اسے حشو کہا جائے لیکن اگر معانی میں تبدیلی ہوتی ہے اور الفاظ تقریباً وہی رہتے ہیں تو یہ الٹ پھیر فی الواقع دلچسپ چیز ہے۔

کیا کہوں کیا رات ہے کیا دن ہیں کیا ایام ہیں
ہائے یہ برسات کے برسات کا برسات کی

برسات کے ایام برسات کا دن برسات کی رات لف و نشر کی صورت میں کا کے کی تین حروف اضافت کو اس طرح جمع کر دینا بہت دشوار ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ شعر کس طرح خلق ہوا۔

وہ صورت نظر اب نہ آوے گی مجھ کو
یہ صورت مجھے اب نظر آ رہی ہے

اس الٹ پھیر کی داد کس مُنہ سے دی جائے۔ زبان کا لطف مزید برآں۔

تری خوش خرامی کو میں جانتا ہوں
قیامت ہے لیکن قیامت نہیں ہے

تری بات کا اور تیری زبان کا
یقیں بھی ہے مجھ کو یقیں بھی نہیں ہے

صبر دشوار طلب چاہ بڑی نا خوش پسند
ہوتے ہوتے ہونا ہے ہونے ہوتے ہوتی ہے

ان مثالوں کو دیکھئے۔ اس سے زیادہ بے تکلفی خیال میں نہیں آسکتی۔ آخری شعر کے مصرع ثانی پر مصرع لگانا دماغ پر مصیبت نازل کرنا ہے یہ بات ظاہر ہے کہ ردیف و قافیہ کے خیال سے شعرا پہلے مصرع ثانی فکر کیا کرتے ہیں یا قافیہ اور اس کا مناسب پہلو سوچا کرتے ہیں۔ غالباً حضرت نوح نے بھی پہلے مصرع ثانی تصنیف فرمایا ہوگا اور پھر یہ سوچا ہوگا کہ اس کا مصرع اول کیا ہونا چاہیئے۔ اگر ہمارا خیال درست ہے تو اس تلاش کے لیے بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔

وہی عشق کی ہیں مصیبتیں وہی ہجر کی ہیں شکایتیں
جو کہیں ہم ان سے تو کیا کہیں جو سنائیں ہم تو سنائیں کیا

نہیں حسن پر ہے غرور بھی نہیں شرم کم ہے لحاظ بھی
وہ نظر کسی سے لڑائیں کیوں وہ نظر کسی سے ملائیں کیا

کبھی پوچھتے ہیں وہ حالِ دل کبھی سرگذشتِ غم و الم
یہ بتا دے کاش کوئی ہمیں کہ بتائیں کیا نہ بتائیں کیا

اسے سو طرح کا خیال ہے ہمیں سو طرح کا لحاظ ہے
کہیں آتے کیوں کہیں جاتے کیوں کہیں آئیں کیا کہیں جائے کیا۔

ان اشعار میں زبان کے نکات اور الفاظ کی مصوری جس خوبی سے نمایاں ہو رہی ہے وہ حضرت نوح اور صرف حضرت نوح کا حصہ ہے۔

(۶) چھٹی خصوصیت معاملہ بندی ہے۔ جسے قدماء کی اصطلاح میں تغزل کہا جاتا ہے۔ اس میدان میں پہلے جرأت نے اور ان کے بعد مومن نے علم امتیازی بلند کیا تھا مگر حضرت داغ نے اس میدان میں شہہ سواری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی معاملہ بندی ان کے قصرِ شہر کا ایک ستون ہے۔ حضرت نوح کا دامنِ سخن بھی اس دولت سے مالامال ہے۔ انہوں نے راز و نیاز کے مضامین ہر غزل میں باندھے ہیں اور ہر جگہ ایک خاص قسم کا بانکپن محبوبانہ انداز میں نظر آتا ہے۔ جس میں لطیف اشارے اور دلچسپ نوک جھونک پائی جاتی ہے۔ قدماء نے غزل کی جو تعریف کی ہے اس کے لحاظ سے معاملہ بندی ہی غزل کا واحد عنصر ہے۔ اس کو الگ کر دیا جائے تو غزل غزلیت کے رتبے سے گر جاتی ہے۔ قدماء نے غزل کی بنیاد تغزل پر ہی قائم کی تھی۔ ان کے بعد طبائع کے مختلف اثرات اس میں اپنا عمل دخل جماتے گئے اور معاملہ بندی کے ساتھ شوخی و ظرافت ناؤ و نوش رندانہ بے باکی وغیرہ مضامین بھی شامل ہو گئے متصوفانہ مضامین دنیا کی ناپائیداری زمانے کی شکایت وغیرہ بھی اسی قبیل سے

ہیں۔ اس طرح غزل کا ضروری عنصر تو وہی معاملہ بندی رہا۔ مگر دوسرے مضامین سے مل کر وہ ایک خوبصورت گلدستہ بن گئی۔ چنانچہ متاخرین کی غزل اسی نمونہ کی ہے۔ جس میں حضرت داغ نے اپنی طبیعت کی شوخی سے عجیب بانکپن پیدا کیا۔ حضرت نوح کی غزل بھی اسی امتیازی خصوصیت کی علمبردار ہے۔

اسے بھی روک رکھو تم اگر ملنے سے رکتے ہو
ہمارے لب پہ کیوں ہر دم تمہارا نام آتا ہے

⁂

اور تو الفت نہ نبھنے کا سبب کوئی نہیں
یا برائی آپ میں ہے یا برائی ہم میں ہے

⁂

جہاں ہوں پیچ والے کیا وہاں باہم صفائی ہو
کبھی کچھ کہہ دیا تم سے کبھی کچھ کہہ دیا ہم سے

⁂ ⁂ ⁂

بہ ظاہر تو ہمارے عشق کی تعریف ہوتی ہے
سمجھتے ہیں وہ جیسا دل میں اس کو ہم سمجھتے ہیں

(۷) ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نوح غزل کے مقطع میں لفظ کشتی یا طوفان اپنے تخلص کی رعایت سے ضرور لاتے ہیں۔ ان کا شاگرد فخریہ یہ مصرع کہتا ہے۔

شاگرد ہوں میں نوحؔ سے طوفانی کا

اس سلسلے میں حضرت نوحؔ ہی کا ایک مصرع سُنیئے۔

لے تری محفل سے وہ طوفان والے چل دیے۔

اب ان طوفانی مقطعوں کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔

نوحؔ کی آنکھوں سے نکلے سیکڑوں طوفانِ اشک
اس کا رونا بھی تو اک دریا دلی کے ساتھ ہے

رونے کی کثرت سب نے بیان کی ہے مگر اس کی کثرت سے لفظ دریا دلی کسی نے منسوب نہ کیا ہوگا۔ اس سے گریہ وزاری کے مضمون میں بھی شگفتگی عالم پیدا ہوگیا۔

نوحؔ سے واقف نہیں ہیں آپ نے یہ کیا کہہ دیا
آج تک طوفان کس کا ہر جگہ مشہور ہے

مصرع ثانی کے ساتھ یہ خوبی بھی وابستہ ہے کہ دیوان کا نام بھی طوفانِ نوح ہے۔

پہلے سے جانتا تھا نوحؔ کو سارا جہاں
ہو گئے مشہور وہ طوفاں اُٹھا کر اور بھی

یہاں بھی ضمناً وہی کنایہ ہے۔

طوفان بحرِ غم نے ڈبویا بہت مگر
کشتی جنابِ نوحؔ کی بچ کر نکل گئی

حضرت نوح کے طوفان کو سنتے ہیں فقط
حضرت نوحؔ کے دیوان کو ہم دیکھتے ہیں

(۸) آٹھویں خصوصیت محاکات ہے جس میں حضرت نوح نے اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ کسی کی قوت بیانیہ کا کمال دیکھنا ہو تو اس کے یہ محاکات کی مثالیں کافی ہوتی ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سازش رکھتی ہے جو سینے میں کبھی،
ہاتھ اپنی نبض پر دھرتے ہیں ہم

خوف و ہراس اور گھبراہٹ کی یہ تصویر کتنی مکمل ہے اور سنئیے۔

کہہ رہا ہے کوئی کس دعوے کے ساتھ
عاشقوں کو قتل ہم کرتے ہیں ہم

ہم کی تکرار نے یہاں کبیر و غرور کے پیکر و کتنا نمایاں کر دیا ہے۔

وہ لیے جاتے ہیں دل کو اپنے ساتھ
دیکھتا جاتا ہے میرا دل مجھے

رفیق سے جدا ہونے کا رنج و افسوس کس حسرتناک پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نزع کے عالم میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اس کی صحیح تصویر بھی دیکھیئے۔

نبض ساقط سرد جسم احباب چپ عاجز طبیب
اب مرے اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہے

رکن ضرب میں "کچھ اور ہی منظور ہے" یہ کنایہ کس قدر بلیغ واقع ہوا ہے۔ ہے تو اخفا مگر صراحت سے بھی زیادہ واضح نیز روزمرہ کے عین مطابق۔

اب ہم انتخاب کے طور پر چند ایسے اشعار یہاں درج

کرتے ہیں۔ جو بلا شبہ نوح کے لاثانی اور غیر فانی شاہکار ہیں اور جس سے موصوف کی شاعرانہ عظمت بخوبی ظاہر ہوتی ہے

کھل نہیں سکتا کسی پر ماجرائے سرنوشت
یہ لفافہ بند رکھا کاتبِ تقدیر نے

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کسی میں زورِ حسن
آئینے کو توڑ ڈالا آپ کی تصویر نے

کھل نہیں سکتا کے ساتھ بند رکھا کا لطف ظاہر ہے۔ نوشت تقدیر کے راز سربستہ کو لفافہ سے تشبیہ دی ہے جو نہایت بلیغ ہے۔ دوسرے شعر میں زورِ حسن کا ثبوت دیا گیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ تصویر کی شعاعیں شیشے میں سے گزر کر باہر آتی ہیں۔ اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں تصویر کا جلوہ پیدا کرتی ہیں۔ اس عمل سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آپ کی تصویر آئینے کو توڑ کر باہر آگئی ہے۔ اس سے بڑھ کر زورِ حسن اور کیا ہوسکتا ہے تصوف کا یہ مشہور مسئلہ کہ حسن مطلق تعین تنقید کے زندان میں نہیں رہ سکتا۔ اس مصرع میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے آنچل اور چلمن کے باہر حسن کی جھلک دکھائی دینے کے بہت سے مضمون باندھے گئے ہیں مگر اس میں یہ زور کہ وہ آئینے کو توڑ کر باہر آجائے آج تک کسی نے نہیں باندھا۔ یہ شعر نہیں بلکہ الہام ہے۔ مغربی شاعری بھی اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ اردو زبان اس پر جتنا ناز کرے کم ہے۔

موت کے ارمان میں بے موت مرجانا پڑا
میرے دل پر تیر مارے آرزوئے تیر نے

بے موت مرنے کا ثبوت رکن صدر کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ مرحابا پڑا یہ الفاظ کس قدر بے انتہا مجبوریوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔ دل پر تیر مارے۔ اس محاورے کا استعمال اس سے بہتر اسلوب میں اور کیا ہو سکتا ہے۔

اب میرے ساقی تامل ہے تجھے کس بات کا
وہ اٹھی وہ آئی وہ چھائی گھٹا برسات کی

رنج و غم اندوہ و حرماں، درد آزار، اضطراب
اک مرے دل پر عنایت ہے ہر ابر سات کی

پہلے شعر میں گھٹا کے تینوں استعمال گھٹا اٹھی۔ گھٹا آئی۔ گھٹا چھائی ایک جگہ جمع کر دیے ہیں۔ اس کے ساتھ "وہ" کی تکرار کتنی خوبصورت اور منظر پر توجہ دلانے کے لیے کتنی ضروری ہے۔ اٹھی کے بعد اور آئی کے بعد چھائی اس حسن ترتیب کو ملاحظہ کیجئے دوسرے شعر میں دو تین نہیں اکٹھے سات ہم جنس لفظ جمع کر دیے ہیں۔ یہ کام بہت دشوار تھا۔ سات ہم جنس لفظوں کو تلاش کرنا اور پھر انہیں ایک مصرع میں حسن ترتیب سے جمع کر دینا قابل دید ہے۔ واو عطف اڑا دی جائے تو یہ مصرع اور بھی بے ساختہ ہو جاتا ہے۔ شاید موصوف نے مصرع اس واو کے بغیر لکھا ہو اور واو محض کاتب کا تصرف ہو۔ رنج و غم اندوہ حرماں واو کے بغیر یہ ٹکڑا فارسیت کے رنگ سے بھی مبرا ہے۔ یقیناً اصل مصرع اس طرح ہوگا۔ دوسرے مصرع میں قافیہ معمول کی خوبصورتی اور اس کے ساتھ لفظ عنایت میں طنز۔ لفظ اک سے دل کی بے کسی

اور لفظ سات سے اک کی تنیس مزید براں۔

وصل کا وہ وعدہ کر سکتے نہیں
ہائے اتنی بھی نزاکت ہے بری

نزاکت کے بہت سے مضمون باندھے گئے ہیں۔ مگر اس مضمون کی نزاکت کچھ اور ہے۔

بعد مرنے کے بھی دل لاکھوں طرح کے غم میں ہے
ہم نہیں دنیا میں لیکن ایک دنیا ہم میں ہے

یا الٰہی عقل سے باہر ہیں تیری حکمتیں
یہ نہیں کھلتا کہ ہم تجھ میں ہیں یا تو ہم میں ہے

دونوں شعروں میں معنی آفرینی کی ایک دنیا آباد ہے۔

خاکِ صحرا پاؤں سے خود ہی الگ ہو جائیں گے
آپ وہ کانٹا نکالیں جو ہمارے دل میں ہے

یہ شعر سحرِ حلال ہے۔ اردو زبان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ایسے ہی شعر کسی شاعر کو حیاتِ جاوید اور اس کی شاعری کو غیر فانی بنایا کرتے ہیں۔ خدا مہربان ہو تو تمام مصیبتیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کو غزل کے روپ میں کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ شعر پڑھتے ہی دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

دل کے دے دینے میں دقت ہے بہت — جان دینے میں دشواری نہیں
زلفِ جاناں ایک ایسی رات ہے — جو کسی بیمار پر بھاری نہیں
عیب سے ہے پاک ہو روشن ضمیر — شمع کے شعلے میں چنگاری نہیں

یہ مضمون مختلف شعراء نے باندھا ہے مگر حضرت نوح نے

جو ثبوت پیش کیا ہے وہ بالکل نیا اور نہایت رنگین ہے۔

مست آنکھوں کو دکھا کر مست اس نے کر دیا
میری قسمت میں یہ دو ساغر تھے دو ساغر ملے

حضرت زاہد تمہیں کعبے میں ہے کس کی تلاش
سنگِ اسود مل گیا اب اور کیا پتھر ملے

پہلے شعر میں آنکھوں کے بعد علامت مفعول کچھ بے لطفی پیدا کرتی ہے۔ مگر حسن بیان کی سادگی اور بے تکلفی اس کی پردہ پوش بھی ہے۔ "دو ساغر تھے دو ساغر ملے" یہ ٹکڑا کس قدر دلکش ہے۔ دوسرے شعر میں سنگ اسود کی رعایت سے لکھنا کہ "اب اور کیا پتھر ملے" رعایت لفظی کا کمال ہے۔ بے ساختگی اس میں بھی ہے۔

اس رخ پہ لو سے کی تھی جو اس نے ہم سری
آج تک داغِ ندامت وہ مہ کامل میں ہے

غیر کو عزت ملی مجھ کو ہوئی ذلت نصیب
یہ بھی ہے وہ بھی ہے سب کچھ آپ کی محفل میں ہے

کوئی آیا بھی ملا بھی اپنے گھر بھی چل دیا
جو مرے دل میں تمنا تھی وہ اب تک دل میں ہے

اب ہمارے قتل کی دے تو شہادت کون دے
ایک دم تھا تیغ کا و قبضہ قاتل میں ہے

چاند کے داغوں کو عیب سے اکثر شعرا نے نسبت دی ہے۔ انہیں داغِ غم داغِ فراق بھی لکھا ہے مگر داغِ ندامت کسی نے

کہا ہوگا۔ دوسرے شعر میں "سب کچھ" کا مفہوم دیکھئے اور اس میں جو لطیف طنز ہے اس کی لطافت کا اندازہ کیجئے۔ پہلے مصرع کا مضمون بہت مہمل تھا مگر دوسرے مصرع میں "سب کچھ" نے جان ڈال دی ہے۔ تیسرے شعر کا مضمون کس قدر دلچسپ ہے۔ جس کے لئے اتنی مصیبت اٹھائی۔ وہ آیا بھی اور واپس چلا گیا۔ مگر دل کی تمنا اسی طرح دل میں رہی۔ چوتھے شعر میں الفاظ کی مناسبت اور رعایت نہایت قابل داد ہے۔ قتل قاتل شہادت۔ تیغ دم قبضہ الفاظ ہیں کہ نگینے جوڑے ہوئے ہیں۔

اس کا غم اس کا تصور، اس کی یاد اس کی تلاش
ایک ہنگامہ ہماری زندگی کے ساتھ ہے
ہر طرف اس کی تجلی ہر جگہ اس کا جمال
ہر کسی کے پاس ہے وہ ہر کسی کے ساتھ ہے
دل دیا بھی تو دیا کس کو ستم ایجاد کو
دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے
اس نگاہ ناز کا مفہوم کچھ کھلتا نہیں
ضد ہے دل کے ساتھ یا دل کی لگی کے ساتھ ہے

ان اشعار کو دیکھئے۔ یہ رنگ سخن یہ زبان یہ حسن بیان یہ اُستادانہ بندش یہ شعریت یہ فصاحت کس کس چیز کی داد دی جائے ایک مصرع پر دوسرا مصرع کس بے تکلفی سے لگایا ہے ردیف کو ہر شعر میں کس احتیاط سے سنبھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حسن معنی کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

کچھ نہیں پھر بھی تو سب کچھ ہے دل بے آرزو
مفلسی دُنیا سے مٹ جائے گی اس مفلس کے بعد

حیرت کا مقام ہے کہ معمولی معمولی باتوں سے کیسے کیسے بلند معانی اخذ کیے گئے ہیں۔ دل بے آرزو کو مفلس کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے۔ اس مفلس کو حقیر سمجھ کر یہ کہنا بھی آسان ہے کہ وہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن کچھ نہیں کو سب کچھ یعنی بیش بہا ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے جو دلیل دی گئی ہے وہ نہایت زور دار ہے۔ جس میں ضمناً یہ اشارا بھی ہے کہ دل کا بے آرزو ہو جانا بہت ہی نادر الوقوع ہے۔

ہزاروں شوخیاں پھر شوخیوں میں سیکڑوں غمزے
تمہیں دُنیا سے کیا مطلب کہ تم خود ایک دُنیا ہو

* * *

جان جب تک ہے ہماری جان ہیں
دل لگانے سے نہ باز آئیں گے ہم
ایسی گستاخی تمہاری شان میں
توبہ توبہ میں تمہیں ظالم کہوں

* * *

ہم کو میخانے میں اس کی جستجو بیکار ہے
ڈھونڈے گا ایک دن چل پھر کے پیمانہ ہمیں

شمع جلتی ہے تو پروانے خود اس کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آگ جلتی ہے تو آکسیجن خود اس کے پاس آجاتی ہے۔ اسی طرح پیمانہ بھی اپنے طالبان کے پاس خود بخود آجائے گا۔ گردش پیمانہ کے لحاظ سے "چل پھر کے" الفاظ کتنے خوبصورت ہیں۔

حسب خواہش مجھے میخوار پلا دیتے ہیں
کوئی تعداد مقرر نہیں پیمانوں کی

آتش عشق سے ہو کیوں نہ مجھے خاص لگاؤ
خاک بھی میرے عناصر میں ہے پیمانوں کی

دوسرے شعر کو دیکھیے معنی آفرینی اور پرواز فکر کا اندازہ کرنے کے لیے یہی ایک شعر کافی ہے۔

میری نظر سے ہے کہ تمہاری نظر سے ہے
ہنگامہ حسن و عشق کا برپا کدھر سے ہے

* *

دل کو ہوا سکون طبیعت سنبھل گئی
دم کیا نکل گیا مری حسرت نکل گئی

پہلے تھی جو خلش وہ مرے دل میں اب نہیں
کانٹا نکل گیا کہ تمنا نکل گئی

* * * *

قدرت میں بھی اثر ہے تمہاری نگاہ کا
جو بات اس نے چاہی کچھ ہو وہی ہوتی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ کیوں کہ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

دردمندان محبت کروٹیں بدلا کیے
ایک پوشیدہ چھری ہو جیسے بستر میں رہی

جس کو سب کہتے ہیں ایک عقدہ نام ہے جس کا گرہ
تیرے گیسو میں رہا میرے مقدر میں رہی

* * * *

جوش وحشت میں دیا قسمت نے میرا خوب ساتھ
مجھ کو بھی جگر میں رکھا خود بھی جگر میں رہی

کیوں نہ دل کی تمنا کو محبت دل کے ساتھ
یہ اسی گھر میں پلی گھر میں بڑھی گھر میں رہی

قتل کا درماں بھی تھا رسوائیوں کا ڈر بھی تھا
کچھ لگاوٹ کچھ رکاوٹ ان کے خنجر میں رہی

* * *

سانس ہی مجھ میں آتی جاتی ہے فقط
اور آنے جانے والا کون ہے

تو نہیں تیرا تصور بھی نہیں
پھر مرا نزدیک پانے والا کون ہے

کوئی ناصح کو یہ سمجھاتا نہیں
وہ مرا سمجھانے والا کون ہے

جو نہ کہنا تھا وہ منہ پر کہہ گیا
دل لگی ہی دل لگی میں دل مجھے

میں ملاتا ہوں انہیں آپس میں ملتے ہی نہیں
یوں مرے اجزائے دل کو اس نے برہم کر دیا

*

رنج کا عیش کا دل میں کوئی احساس نہیں
غم نے کہ دنیا ہی بدل دی ترے دیوانوں کی

*

نامہ بر خط کے تو ظالم نے اڑائے پرزے
شکر کرتا ہوں کوئی حرف نہ تجھ پر آیا

*

محبت کی محبت ہے عبادت کی عبادت ہے
جہاں جلوہ کسی کا دیکھ لینا سر جھکا دینا

* * *

دھوپ میں وہ تھے جنہیں اس سے بھی آگاہی نہ تھی

وہ علی اکبر جو نازک تھے گلِ تر سے سوا
دیر تک لڑتے رہے اللہ اکبر دھوپ میں
پاؤں رکھنے میں بھی ان کے سو طرح کا فیض تھا
شامیانہ گرد بن جاتی تھی اڑ کر دھوپ میں
سر ٹپکتی ہے ابھی تک ہر در و دیوار پر
دھوپ اس غم سے کہ تھے سبط پیمبر دھوپ میں

اختر دھوپ میں چکر دھوپ میں اس زمین میں مدت ہوئی حضرت میکش کی ایک غزل پڑھی تھی صرف ایک شعر جس میں کبوتر کا قافیہ تھا یاد رہ گیا۔ وہی ملاحظہ ہو ـــــــ

خط وہ کیا لیتے اترنے بھی نہ کوٹھے پر دیا
شام تک اڑتا رہا میرا کبوتر دھوپ میں

اس میں شک نہیں کہ یہ قافیہ بہت لاجواب بندھا ہے۔ اسی مشکل اور محدود زمین میں حضرت نوح نے بھی ایک سلام لکھا ہے یعنی میدان خیال بھی محدود کر دیا ہے مگر باوجود اس سنگلاخ زمین کو گلزار پر بہار بنا دیا ہے۔ چند شعر اوپر درج کیے گئے ہیں۔ دیکھیے کیا کیا گل افشانی فرمائی ہے۔ پہلے اس سلام کا مطلع اسی طرح تھا مگر بعد میں اس پابندی کی وجہ سے کہ مخلوط قوافی کے لیے مخلوط قوافی کا مطلع بھی ہونا چاہیے مصرع ثانی میں تبدیل کر دیا اب "طوفانِ نوح" میں مصرع ثانی یہ ہے۔

دھوپ میں ہاں دھوپ میں جلتی زمیں پر دھوپ میں

ہمیں چونکہ پرانا مصرع دیا تھا اور وہ مصرع بھی مطلع کی شان

دو بالا کرنے والا ہے اس لیے وہی لکھ دیا۔ آخری شعر میں متنی آفرینی کا جو کمال دکھایا گیا ہے۔ وہ حضرت نوحؔ کے لیے ہر طرح سرمایہ افتخار ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ صرف غزل سے متعلق تھا۔ لکھنے کو تو اتنا کچھ لکھ دیا مگر حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ کلام کا جو انتخاب کیا گیا تھا اس کا ایک چوتھائی حصہ بھی درج نہیں ہو سکا۔ محاسن کلام کو ظاہر کرنے میں بھی ہمارا قلم بے شبہ شکستہ رہا ہے۔ اگرچہ بہت سی خوبیاں اس کلام میں وجدانی کیفیت رکھتی ہیں۔ انہیں الفاظ میں بیان کرنا بھی دشوار ہے۔ پھر بھی اس ضمن میں ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش تھی۔ طول کلام کے خیال سے قلم روک لیا گیا ہے۔ اب باقی اصناف سخن میں بعض حصوں کا نہایت مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ تمام اصناف سخن میں حضرت نوحؔ کا رنگ سخن یہی ہے اور یہ بات ان کی قادر الکلامی کے ثبوت میں نہایت زبردست شہادت پیش کرتی ہے۔

اُستادوں کی غزل پر خمسہ لکھنے کا رواج اُردو زبان میں عام ہے۔ نظم کی یہ صنف بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ ایک تو غزل کسی نامور استاد کی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس نامور استاد کی غزلیات میں یہ غزل نہایت چیدہ اور بلند پایہ سمجھ کر منتخب کی جاتی ہے۔ اس قسم کے بلند رتبہ کلام پر مصرع لگانا آسان نہیں اپنی پرواز فکر کو اس نامور شاعر کی پرواز فکر تک پہنچانا اور اس پائے کا کلام لکھنا ہوتا ہے کہ نئے اور پرانے مصرعوں میں کوئی پیوند اور جوڑ شناخت

ہیں نہ آسکے۔ پھر یہ خوبی پیدا کرنی ہوتی ہے کہ سننے والے اس بات کو محسوس کریں کہ شعر کے مضمون میں فی الواقع اتنی کمی رہ گئی تھی جو ان جدید مصرعوں کے پیوند سے مکمل ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خمسہ کی خوبی شاعر کے بہت بڑے کمال کی شہادت ہے۔ حضرت نوح نے مختلف مشاہیر کے کلام پر خمسے کہے ہیں دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حضرت اشک مرحوم سابق نواب رام پور کی غزل پر ایک خمسہ کہا ہے۔ ان کی غزل کا ایک شعر یہ تھا۔

شفا کیسی دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں
محبت کا جو ہو بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

اس کی تخمیس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔

عبث ہر وقت دعوے ہیں عبث ہر بار باتیں ہیں
جنہیں آسان سمجھتے ہیں بہت دشوار باتیں ہیں
مسیحا غیر ممکن بس یہی دو چار باتیں ہیں
شفا کیسی دوا کیسی یہ بیکار باتیں ہیں
محبت کا جو ہو بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

والیِ ریاست ٹونک کی ایک غزل پر بھی خمسہ کہا ہے۔ اس میں ایک شعر یہ تھا ——

جب ایسا ہے تو پھر ملنے ملانے میں تکلف کیوں
نہ مطلب آشنا میں ہوں نہ مطلب آشنا تم ہو

اب تخمیس دیکھیے ——

جب ایسا ہے وہاں مجھ کو بلانے میں تکلف کیوں
جب ایسا ہے یہاں تک تم کو آنے میں تکلف کیوں
جب ایسا ہے تو سن سے مان جانے میں تکلف کیوں
جب ایسا ہے تو پھر ملنے ملانے میں تکلف کیوں
نہ مطلب آشنا میں ہوں نہ مطلب آشنا تم ہو

حضرت داغ کی غزل کا ایک شعر ہے۔

جب صبح ہوئی آ گئے ناصح — انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں میں

تخمیس ملاحظہ ہو کس شان کے مصرعے لگاتے ہیں۔

قابلیت جتا گئے ناصح — مغز بک بک کے کھا گئے ناصح
ایک مجھ کو ہی پا گئے ناصح — جب ہوئی صبح آ گئے ناصح
انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں

حضرت ظہیر دہلوی کا ایک شعر یہ تھا۔

تیرے کوچے میں تیرے وعدے پر — دوسرا تیسرا یہ پھیرا ہے

اس کی تخمیس یہ ہے۔

اس طرف سے ادھر ادھر سے ادھر — میں لگاتا ہوں رات دن چکر
آج بھی حیلہ جو ستم پرور — تیرے کوچے میں تیرے وعدے پر
دوسرا تیسرا یہ پھیرا ہے

تخمیس کے یہ چند نمونے پیش کر چکنے کے بعد رنگ جدید کا مختصر انتخاب پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کے بہت سے ہم عصر جو دنیائے شاعری میں کافی شہرت رکھتے ہیں اس رنگ میں بالکل بیرنگ ہیں۔ حضرت نوح کا قلم معجز رقم اس رنگ میں بھی ایسا

خروش خرام ہے جیسا رنگ قدیم میں وہ نظر آتا ہے۔

دربار دہلی پر ایک نظم لکھی ہے نظم کیا ہے الفاظ کی نادر مصوری ہے۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں۔

چمکا اختر جاگی قسمت نکلا جوبن نکھری رنگت
پلٹی صورت بدلی حالت آئی عشرت بھاگی عسرت

دلّی کے دربار کو دیکھو دلّی کے بازار کو دیکھو
دلّی کی سرکار کو دیکھو دلّی کی بھرمار کو دیکھو

پلٹن کے انداز نرالے پہرے پر مامور رسالے
جان خدا کو دینے والے اکثر گورے اکثر کالے

آپس میں بے باکی دیکھی ہشیاری چالاکی دیکھی
وردی نیلی خاکی دیکھی کیا کیا شان خدا کی دیکھی

٭ ٭ ٭ ٭

ملکی اور قومی رنگ میں بھی بعض نظمیں لکھی ہیں۔ بیان کی صفائی سلاست روانی بندش کی پختگی خیالات کی شستگی اور ہر جگہ شاعرانہ نکتہ پروری عجب بہار دکھا رہی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پھیلا نفاق باہم ہو اتفاق کیوں کر
کچھ ہے یقیں تمہارا کچھ ہے گمان ہمارا

اقبال کی ترقی کوشش پہ منحصر ہے
پھر ہے زمیں ہماری پھر آسماں ہمارا

اللہ سے ہم اپنے مذہب کی خیر مانگیں
مٹ جائے گا کسی دن یہ بھی نشان ہمارا

باہم سے دوستی کا دم لوگ بھر رہے تھے
یا ہو گیا مخالف سارا جہان ہمارا

ہندو مسلمان کے عنوان سے چند شعر غزل کی طرز میں لکھے ہیں۔ ان میں بھی وہی آن بان موجود ہے۔

ہند کی آن بان ہیں دونوں
ایک ہی تن کی جان ہیں دونوں

خلق اس پر ذرا نگاہ کرے
اپنے خالق کی شان ہیں دونوں

بار اپنا اٹھا نہیں سکتے
اس قدر ناتوان ہیں دونوں

نہ حرم ہے نہ اب وہ بت خانہ
ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں دونوں

فرض ان پر ہے ان کی رکھوالی
ملک کے پاسبان ہیں دونوں

تیر اوروں پہ کیا لگائیں گے
خود یہ اتری کمان ہیں دونوں

کوئی صورت نہیں صفائی کی
دل میں یوں بدگمان ہیں دونوں

غور فرمائیں ہر شعر میں ایک انداز ہے۔ ایک رنگ میں لکھا ہے۔ جو کسی حال میں پھیکا نہیں ہوتا استادوں کی ٹھوس بندشیں بیان کی سادگی طرز ادا کا بانکپن ہر شعر سے نمایاں ہے۔

تاریخ گوئی میں بھی حضرت نوح کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ تدخلہ یا تخرجہ کو کبھی پسند نہیں کرتے اور اس کو عجز طبیعت سمجھتے ہیں۔ جو تاریخ کہی ہے اس میں سال تاریخ جمع یا تفریق سے بے نیاز ہے۔ حالانکہ اکثر مورخین تدخلہ و تخرجہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور بعض مشاہیر نے اس میں نادر خوبیاں پیدا کر کے عیب کو ہنر بنا دیا ہے۔ مثلاً

الف کشیدہ ملائک ز فوت اکبر شاہ

فوت اکبر شاہ کے اعداد میں الف کا ایک عدد کم کیا ہے۔ مگر معنی کے لحاظ سے صنعت ایہام پیدا ہو گئی ہے۔ کیوں کہ محاورہ میں

الف کشیدہ کے معنی افسوس کرنا ہے۔

حضرت امام حسین کی شہادت کا سال تاریخ کسی نے کہا ہے۔

سر دین را برید بے دینے

اس میں دین کا سر یعنی دال کاٹ کر باقی ی ن کے اعداد ساٹھ شمار کیے ہیں اور یہی سال شہادت ہے لیکن انصاف یہی ہے کہ مادہ تاریخ سالم ہونا چاہیئے کیونکہ سالم عدد نکال نہ سکنے کا عیب ہر حال میں قائم رہتا ہے خواہ تدخلہ اور تخرجہ میں کتنی ہی خوبی کیوں نہ پیدا کی جائے مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حافظ ابوالقاسم صاحب کے دیوان کی تاریخ ولادت یہ ہے۔

فرزند حافظ (۱۳۱۲ ہجری)

حضرت بیخود بدایونی کے دیوان کا سال تاریخ یہ ہے۔

تصویر بیخود (۱۳۲۸ ہجری)

ایک مکان کا سال تعمیر یہ ہے۔ منظور رشک بہار (۱۹۱۸ ہجری)

* * *

اب آخر میں ظریفانہ کلام کا کچھ اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے حضرت نوح کی طبیعت کا چلبلا پن بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگ سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے

بدلے وہ سب طریقے یاروں نے زندگی کے
شربت پہ خاک ڈالی ہوٹل میں چائے پی کے

واعظ کے وعظ سے ہے لیکچر کی شان پیدا
منبر پہ ہو رہے ہیں اوصاف ممبری کے

ہیٹ کو ملنے لگی سر پر جگہ — خیر مانگیں شیخ جی دستار کی
پہلے لیتے تھے خبر اخبار سے — اب وہ لیتے ہیں خبر اخبار کی

سبحان اللہ سے اور کی کے فرق سے معانی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔

جب یہ پوچھا حکم کیا لکھا گیا درخواست پر
کہہ دیا دفتر سے تم کو نقل لینی چاہیئے
اور دفتر سے اگر طالب ہوا ہیں نقل کا
تو وہ بولے اس کی بھی درخواست دینی چاہیئے

* * *

اہل مشرق سے نہیں کرتے وہ بات — اہلِ مغرب کی یہی پہچان ہے
نوکری ملنے میں آسانی نہیں — پاس ہو جانا بہت آسان ہے
ڈھونڈتے ہیں کونسلوں میں سیٹ وہ — اپنے گھر سے جن کو اطمینان ہے
روز کے چندوں سے عاجز آ گئے — لیجیئے حاضر ہماری جان ہے

* * *

ہے نئی تعلیم کا یہ انقلاب — اپنی بی بی تک پرائی ہو گئی
دستِ مغرب سے جو دامن بچ گیا — تم گھر گھر آ کے ثانی ہو گئی
ریل پر قربان ہوٹل پر نثار — باپ دادا کی کمائی ہو گئی
پاس آیا کے جو میں آیا گیا — خان ساماں سے لڑائی ہو گئی

اس کیشتِ زعفران کو دیکھیئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح بلکہ اکبر الہ آبادی بول رہے ہیں۔ دوسرے شعراء نے بھی اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر

حرکت مذبوحی کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ عجز طبیعت سے مجبور ہو کر رہ گئے۔ لوگوں نے پکوڑوں کی پھبتیاں اڑائیں اور رسوائے خلق ہو کر خاموش ہو جانا پڑا۔ بات یہ ہے کہ اختلاف طبائع کی وجہ سے ہر شخص ہر میدان کا مرد نہیں ہوتا۔ جس کی طبیعت ہر سانچے میں ڈھل سکے ہر رنگ میں لکھ سکے اور اچھا لکھ سکے۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ دنیائے شاعری میں اس وقت حضرت نوح کا دم غنیمت ہے۔ انہوں نے دہلوی یا لکھنوی نہ ہونے کے باوجود اردو زبان کا وہ کمال ظاہر کیا ہے۔ جو بلا شبہ قابل رشک ہے۔ وہ صحیح معنوں میں حضرت داغ کے جانشین کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اردو زبان کی ایسی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اسے اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے کہ اس سے زیادہ ترقی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ خدائے کریم موصوف کو صحت و دولت اور درازی عمر کی نعمتیں ارزانی کرے۔ تاکہ ان کے فیض سخن سے چشمہ باغ سخن کو دیر تک سیراب کرتا رہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

امیر مینائی

میر تقی کے بعد جو باکمال شاعر خدائے سخن کے لقب سے یاد کیا گیا وہ حضرت امیر مینائی لکھنوی ہیں۔ اساتذہ لکھنؤ کی غزل گو جماعت میں سے اگر سربرآوردہ شعراء کو منتخب کیا جائے تو آتش اور ناسخ کے بعد تیسرا نمبر حضرت امیر کا ہوگا۔ یہ نواب مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ حضرت اسیر کا نام بھی انہیں کی تنویر سخن سے چمکا ہے۔ بہت بڑے عالم محقق فن اور ضروریات شاعری سے کماحقہ باخبر تھے۔ لکھنؤ میں جلال تسلیم شمشاد ان کے بلند پایہ ہم عصر استاد ہو گذرے ہیں۔ ان بزرگوں کی تحقیق فن اور مسلم الثبوت حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر حضرت امیر کا پایۂ سخن ان کے مقابلہ میں بہت بلند اور بہت امتیازی ہے۔ غزل کے علاوہ ان کی قصیدہ گوئی بھی اپنے تمام ہم عصروں میں انہیں ممتاز کیے جانے کے ثبوت پیش کرتی ہے۔ مرزا سودا، سید انشاء، اور ذوق کے بعد کسی چوتھے قصیدہ گو کو منتخب کیا جائے تو کمال سخن گوئی حضرت امیر ہی کا نام انتخاب کریگی۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ قصیدہ کی صنف میں حضرت امیر اردو شاعری کا

پُر تما ستون ہیں ۔ مدح کی منزل میں تو ہر قصیدہ پھیکا پڑ جاتا ہے ۔ قصیدہ گو
کی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ یا تو قصیدے کی تشبیب سے ہو سکتا ہے ۔
یا مدح کی طرف گریز کرنے کے مقام سے ۔ یہ دونوں چیزیں حضرت امیرؔ
کے قصائد میں بہت ہی قابل داد ہیں ۔ معنی آفرینی جدت ادا اور نزاکت
خیال کے لحاظ سے ہر تشبیب میں ان کی طبیعت دریائے مواج نظر
آتی ہے ۔ نئے نئے مضامین نئی نئی مگر بلیغ تشبیہات اور تمثیلات کی
اتنی کثرت ہے کہ انہیں دیکھ کر مصحفیؔ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ۔

کہتا ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

جدت آرائی بھی ان کی تشبیب کا ایک خاص وصف ہے ۔ دو
قصیدے ایسے ہیں جو مناظرے سے شروع کیے جاتے ہیں ۔ ایک مناظرہ
دانش اور وہم کا ہے ۔ دوسرا شانے اور آئینے کا ۔ دونوں بہت ہی دلچسپ
ہیں ۔ انہیں پڑھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے کوئی نکتہ کسی اور
کے لیے نہیں چھوڑا ۔ لفظی مناسبات کا پورا التزام رکھ کر وہ طلسم
بندی کی گئی ہے کہ ذوق سخن مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے ۔ صرف چند
اشعار ملاحظہ ہوں ۔ آئینہ کہتا ہے ــــــ

آئینہ شانے سے کہتا ہے کہ سر چڑھ نہ بہت
منہ کی کھائے نہ کہیں چاک نہ تیرا ہو جگر
آب و ناں مجھ کو نہیں ہے کسی مہماں سے عزیز
دشمن و دوست کے منہ پر ہے کشادہ مرا در
ہاتھ سے دامن دولت نہ کسی دن چھوٹا
اہل دولت ہی کے زانو پہ ہوئی عمر بسر

یہ تو اپنی تعریف تھی کئی شعر اسی مضمون کے کبیر شانے کی مذمت میں کہے ہیں۔

بال بیکا ہو حسینوں کا تو توڑیں ترے دانت
دانت ایذا لگے دینے تو شکستہ بہتر۔

پنجۂ شل سے نکلتا نہیں ہرگز کوئی کام
خشک ہو شاخ تو اس سے نہیں امیدِ ثمر

کرکری تیزیِ دنداں سے ہوئی اور تری
جس میں دندانے پڑیں تیغ ہے وہ بے جوہر

شانہ جواب دیتا ہے ــــــــــ

رتبہ میرا تجھے معلوم نہیں سُن مجھ سے
منحصر ہے صنعتِ عقدہ کشائی مجھ پر

کہتے ہیں پنجۂ مژگاں کو جو شانہ شاعر
اس کو آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں اربابِ نظر

اس میں بھی لفظ ہے شانے کا زہے عز و شرف
جل شانہ جو ہے توصیف خدائے اکبر

آئینے کی مذمت میں کہتا ہے ــــــــــ

روبرو اور ترا حال ہے غیبت میں کچھ اور
صاف عالم کی دو رنگی کا ہے تجھ میں بھی اثر

خود نمائی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی بھی وصف
سادہ لوحی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی ہنر

سوجھتا خاک نہیں کور دلی سے تجھ کو
سخت جاں تیرہ دروں اصل ہے تیری پتھر

ان اشعار سے جن میں حقیقت و مجاز دونوں کی بزم آرائی باغ و بہار سے کم نہیں ہے۔ حضرت امیر کی بے پناہ قوت بیانیہ اور قادر الکلامی اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ تقریباً پچاس شعر اس مناظرے میں اسی رنگ اور اسی شان کے کہے ہیں۔ اس قسم کے مناظروں میں مدح کی طرف گریز کرنا آسان نہیں ہوتا مگر بقول مصنف ——

جس زمیں پر کہ میرا ابرِ طبیعت برسا
گردِ ہنگامۂ پیشین و پسیں بیٹھ گئی

یہ گریز بھی قابل ستائش ہے۔ مثلاً آئینہ و شانہ کی بحث جب جنگ و جدل تک پہنچ گئی۔ تو دونوں کے طرفدار بھی آ پہنچے ان طرفداروں کا انتخاب بھی شاعرانہ نوعیت کا ہے۔ رخ صاف آئینے کا طرفدار ہوا۔ زلف نے شانے کی حمایت پر کمر باندھ لی۔ چاند سورج آئینے کے مددگار ہو گئے۔ اور سایہ شانے کا۔ ایک طرف شام اور ایک طرف صبح کا نور پھر زلف کی حمایت کے لیے سنبل اور شب بو کی فوج میدان میں آ گئی اور لالہ و گل کا لشکر روئے انور کی حمایت میں نکل آیا۔ معرکہ دست و خیز گرم ہو گیا یہ رنگ دیکھ کر پیر گردوں نے کہا کہ اس طرح قیامت میں جہاں زیر و زبر ہو جائے گا۔ اس لیے بیچ میں پڑ کر کہا کہ یہ فساد اچھا نہیں۔ اس جنگ سے صلح بہتر ہے۔ تم دونوں کو چاہیئے کہ اس جھگڑے کو نپٹانے اور صحیح فیصلہ حاصل کرنے کے لیے اس کی عدالت میں پہنچو۔

جو بڑا انصاف کرنے والا ہے اور حکمران اس کا نام کلب علی خاں بہادر ہے۔ جو کہ شمس کا برج ہے وہ عالم و ہنر کو زینت دینے

والا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک قصیدے میں تمہید ہی عزاداری کے مضمون کی ہے۔ مدح کے لیے اس قسم کی تمہید دو خاص حادثوں کی وجہ سے شامل کرنی پڑی۔ مدحیہ مضامین میں اس قسم کے مضامین کو مربوط کرنا بہت مشکل کام ہے۔ خاص کر اس صورت میں کہ عزاداری کے مضامین بہت دردناک ہیں مثلاً۔

وہ برق وش ہوئے آزار کھینچ کر معدوم
کہ جن کی خاک پہ روتا ہے ابرِ آزاری

جو دن کو مرتے ہیں ہر شام ان کے ماتم میں
پہن کے آتی ہے شب جامۂ عزاداری

ہجومِ غم کا ہوا نیند ہو گئی پامال
وہ آئی آنکھوں میں طالع میں تھی جو بیداری

ہر اک سوار ہے پا در رکاب عالم میں
سمندِ عمر میں کتنی ہے تیز رفتاری

مسافر اس میں روانہ ہیں آنکھ بند کیے
عدم کی راہ میں دیکھو ہے کتنی ہمواری

لحد میں ان پہ پڑا بوجھ سیکڑوں من کا
کسی کی جن سے نہ ہوتی تھی نازبرداری

اس رنگ کے ۲۵۔ ۳۰ شعر کہ ہر شعر میں مضمون آفرینی کی داد دی ہے۔ پھر دو تین شعروں میں حادثوں کا اشارتاً ذکر کر دینے کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں۔

جگہ یہ حضرت آقائے نامدار کا تھا
کہا یہ داغ اُٹھا کر جو مرضی باری

جنابِ کلب علی خاں بہادر ذی جاہ
کہ جس سے امن میں ہے خلقت خدا کی

عرفی کی زمین میں جس کا ایک مصرع یہ ہے۔

اخگر از فیضِ ہوا سبز شود در منقل

سودا نے بھی معرکے کا ایک قصیدہ کہا ہے اس قصیدے کا پہلا مصرع یہ ہے۔

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

سودا نے اس کی تشبیب میں کئی شعر معرکۃ الآرا کہے ہیں۔ جدول کا قافیہ یہ ہے۔

آب جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

حضرت امیر نے بھی اس زمین میں ایک سیر حاصل قصیدہ کہا ہے۔ تمہید بھی۔ بہاریہ ہے۔ مگر عالم خواب کی ہے اور عالم خواب میں باغ و بہار کا وہ منظر پیش کیا ہے کہ باید و شاید چند شعر ملاحظہ ہوں ______

لالہ آتا ہے نظر یوں پسِ دیوارِ چمن
جس طرح شیشہ محل میں کوئی روشن مشعل

دستِ مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہہ کو آنکھیں
پھر بھی دیوار پہ چڑھتی تھی تو جاتی تھی پھسل

سینے تانے ہوئے پھرتے تھے چمن میں طاؤس
اس تمنا میں کہ لگ جائے گلے سے بادل

* * *

لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم
غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل
گل نسریں پہ تھا یوں عکس شعاع خورشید
جیسے سونے کو کرنی ساغرِ الماس میں حل

* * *

سوداؔ نے قدرت نامیہ کے اثر سے گاؤ زمین کی شاخ میں کونپل پھوٹی ہوئی دکھائی تھی۔ حضرت امیرؔ نے اس سلسلہ بیان میں ایک نئی شاخ تیار کر لی۔

اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیضِ نمود
نکلے گو بارہ میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل

ہوش گردش وغیرہ قوافی میں ایک قصیدہ کہا ہے اس میں ایک بزم آراستہ کی ہے۔ اس بزم میں مشاہیر شعراء رونق افروز ہیں۔ ہر ایک کے تعارف میں مناسبات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے مگر سعدیؔ کا تعارف تو بہت ہی عجیب ہے۔ اس تعارف میں قافیے کی تلاش بھی قابل داد ہے۔ فرماتے ہیں ؂

یہ شیخ سعدی ہے جس نے نہ چشم روشن کو
کیا ہے نظم گلستاں کی ہیئت میں چش و دش

اس شعر کی شان نزول سعدیؔ کا یہ شعر ہے۔

پیرِ ہفتاد سالہ جنسی مسکنا
کور مقرے یہ خراب نی جیش و وش

سید انشاؔ ۔ اور مصحفیؔ نے کروٹ۔ تلپٹ۔ آہٹ وغیرہ خالص ہندی قافیوں میں قصیدے کہے ہیں۔ حضرت امیرؔ نے بھی ان قوافی میں ۱۳۵ شعر کا قصیدہ کہا ہے جو درحقیقت انشاؔ اور مصحفیؔ کے مذکورہ قصاید کا جواب ہے۔ تمہید میں خود ہی انہوں نے یہ بات ظاہر کر دی ہے ——————

پی چکے گو کہ مئے صاف سخن کوئے نوش
رہ گئی ساغر و مینا و سبو میں تلچھٹ

خم ہیں میخانے میں ایسے بھی کہ ٹوٹی نہیں مہر
کھول منہ بھر کے صراحی کو پی جا غٹ غٹ

دو قصیدے جو سُنے مصحفیؔ و انشاؔ کے
واقعی سکۂ رائج ہیں و لیکن سلپٹ

ذائقہ ہے تو فقط گرمی و بے باکی کا
پر فصاحت سے یہ کہتے ہیں کہ ہٹ دور ہو ہٹ

سخت پتھر سے جو تھے قافیۂ نامانوس
کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغ زباں ان کی چٹ

ہمتِ فکر نے باندھی جو کمر بہر جواب
اول اول تو طبیعت کو ہوئی گھبراہٹ

آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا
کر لیا ملکِ مضامیں کا علاقہ کوٹ

اس کے بعد تشبیب شروع ہوتی ہے۔ عالمِ خواب میں ایک حور کا منظر پیش کیا ہے ـــــــــ

کچھ عجب فتنہ کہ اس کی جو نظر جائے پلٹ
ساتھ ہی چرخ پھرے لے یہ زمانہ کروٹ

شعلۂ رخسار جفار کار قیامت آفت
شوخ و عمارۂ غضب قہر چھلاوا نٹ کھٹ

پختہ کار اس کو جو دیکھیں طمع خام کریں
ثمرِ پیش رس حسن ہیں وہ گدراہٹ

پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں
ناچنے ہی پہ جب آئے تو کہاں کا گھونگھٹ

اس قصیدے میں شاید ہی کوئی قافیہ چھوڑا ہو۔ مرگھٹ رپٹ کوڑا کرکٹ۔ نکٹ۔ ڈیوٹ۔ رہٹ۔ سنگھٹ۔ جیوٹ (حوصلہ) وغیرہ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ گزٹ کورٹ اور پرمٹ کے انگریزی الفاظ بھی ان میں شامل ہیں۔ ایک قافیہ تریاہٹ (عورتوں کی ضد) ہے۔ پھبتی کے مضمون میں پالٹ کا مذکور بھی ہے مگر جو ہے اپنی نشست میں فرد ہے۔ بطور نمونہ عرف کے قافیئے ملاحظہ ہوں۔

جلوہ گر مردمِ چشم وصف مژگاں سے یہ صاف
حور بیٹھی ہے در خلد کھولے ہوئے پٹ

حور کے دامن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر ہاتھ خالی گیا۔ اس محرومی دل پر بھی چوٹ لگی یہ کیفیت اس طرح بیان کی ہے۔

چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی
تازیانے سے نہیں کم وہ پڑی تیغ چوبٹ

چپ رہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد
تھی ملاقات کہاں کی یہ تیزی جھٹ پٹ

دیکھ کر ابروئے پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں
پہلوان دو ہیں کہ کشتی میں ہوئے ہیں غٹ پٹ

ناطقہ خانہ دولت ہے ترا نام صفت
میں مکیں ہوں تو مکاں جائے زر و سیم سے پٹ

جس کا تو دوست ہوا اس نے خزانہ پایا
خط لکھا جس کی اسی شخص کو ہنڈی گئی پٹ

در دولت ہے عجب فیض کی چوپڑ کہ جہاں
کبھی پڑتا نہیں پانسا کسی تقدیر کا پٹ

عدل وہ ہے کہ زمانے میں نہیں ہوئے فساد
ہو تو شک جو چھکیتوں میں کبھی ہو کھٹ پٹ

ان قصائد کو تازہ مضامین اور تازہ تشبیہات تلازمات اور مناسبات شعری کی کثرت سے گنج قارون کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اگرچہ حضرت امیرؔ کے شاگردوں کی جماعت میں بڑے بڑے بلند پایہ شعراء شامل ہیں۔ مثلاً جلیلؔ، ریاضؔ، کوثرؔ، مضطرؔ، حفیظ، دلؔ شاہجہانپوری وغیرہ؛ ان کے علاوہ ان کے صاحبزادے بھی برگزیدہ شاعر تھے۔ مثلاً اخترؔ مینائی جن کا پایہ سخن ذیل کے دو شعروں سے ظاہر ہے۔

صبح کو کلیاں چٹک کر ہار کی
ان کو چونکاتی ہیں خواب ناز سے
غنچے چٹکیں گل ہنسیں اے باغبان
ہم کراہیں بھی دبی آواز سے

مگر قصیدہ گوئی کے دشوار گذار رستے میں حضرت امیرؔ کی گرم رفتاری کسی شاگرد کو ساتھ لے کر نہیں چل سکی۔ بقول مرزا غالبؔ مرحوم۔

ما ہمائے گرم پرواز یم فیض از ما مجوئے

سایۂ ہم چوں دور بالائے دور از بالِ ما

ان نامور شعراء میں حضرت جلیلؔ نے ضرورت کے وقت کے لحاظ سے البتہ چند قصیدے کہے ہیں مگر ان میں بعض معنی آفرینی اور نزاکت خیال کا عنصر کم ہے جو کچھ ہے وہ بیان اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی چاشنی ہے۔ حضرت داغؔ کے قصاید بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ اور انہوں نے بھی یہی دو تین چیزیں اپنا عنوان قرار دی ہیں۔

اگرچہ زمانہ حال کے مذاق سخن سے قصیدہ گوئی اب خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج کل ادب برائے زندگی کا نعرہ زوروں پر ہے۔ غزل ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے زندہ رہنے کا سبب یہ ہے کہ کچھ تو شعرائے حال زمانہ حال کے مذاق سخن کا پورا لحاظ کر رہے ہیں۔ اور رنگ قدیم کے عریاں مضامین کو قطعاً ترک کر چکے ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ غزل میں ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب دونوں جوہر موجود ہیں۔ غزل کا ہر ایک شعر ادب برائے ادب تو ہوتا ہی ہے مگر اس میں بہت معقول تعداد ایسے اشعار کی بھی ہوتی ہے جنہیں ادب برائے زندگی بھی کہا جا سکے۔ مثلاً۔

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

لاکھ دنیا تلک آزار گوارا تھے مجھے
ایک تیرا نہ مگر درد جدائی دنیا

کس سے نباہیے کہ سوائے وفات کے
دنیا میں ہائے نام وفا کا نہیں رہا

لیکن قصیدہ ایسی صنف ہے کہ اس کا وجود ادب برائے ادب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لیے اس صنف کا اتنا نا مقبول ہو جانا کہ سب کی نظروں سے گر اپنی موت ہو جائے قابل تعجب نہیں ہو سکتا۔ جھوٹی مدح سرائی نے اس انجام کو اور بھی تقویت دی ہے۔ یہ زمانے کے انقلابات ہیں۔ ان کے اثر سے ان لوگوں کے کمال میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ جنہوں نے اپنے زمانے کے مذاق سخن یا وقتی ضرورت یا حسن عقیدت کے اقتضاء سے اس صنف کو اختیار کیا اور اس میں اپنی دماغ سوزی کی جہاں معنی تجلی گاہ طور بنا دیا۔

اب ہم قصیدے کی بحث کو اسی جگہ چھوڑتے ہیں۔ اور حضرت امیر کی غزل گوئی پر جو ان کی شاعری کا سب سے بڑا میدان ہے متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہیں ہر ایک غزل میں گلزار معنی اتنا سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ کہ ذوق سخن چشم تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ قدم قدم پر بہار بے خزاں فردوس نظر معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بہار رنگ قدیم کی آخری بہار ہے مگر اتنی دلکش

اتنی مرغوب اور اتنی جاذب نظر ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تازہ مضامین نئی تشبیہات نئے اسلوب بیان کی اتنی کثرت اور فراوانی کے باوجود پرگوئی کا یہ عالم ہے کہ بہت سی زمینوں میں دو غزلہ سہ غزلہ بلکہ بعض زمینوں میں چار چار پانچ پانچ غزلیں کہہ ڈالی ہیں۔ اور کوئی شعر ایسا نہیں ہے جسے محض قافیہ پیمائی کہا جا سکے۔

پوچھا گیا نہ حال تمہارے شہید کا

اس زمین میں پانچ غزلیں ہیں۔

بے فائدہ غریب کی مٹی خراب کی

اس زمین میں بھی پانچ غزلیں مراۃ الغیب میں موجود ہیں۔ اور ہر ایک غزل اپنے رنگ میں لاجواب ہے تازہ اور نئے مضامین کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ———

نئی تقریب پریوں کے بلانے کی ہے دیوانوں
کسی صحرا میں عرس اک دن کریں چل کر سلیماں کا

کہاں ساماں تھا وحشت میں کہ نامہ یار کو لکھتا
دیا قاصد کو پرزہ پھاڑ کر میں نے گریباں کا

٭ ٭ ٭ ٭

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

تری نیچی نگاہیں سایۂ مژگاں میں پھرتی ہیں
پرے میں جیسے بانکے پینترے ہر سو بدلتے ہیں

دزدِ سخن سے معنی رنگیں کو کیا خطر
مہندی لگائے گا کوئی کیوں کر لگی ہوئی

دیکھ کر آئینے کو عکس سے کہتا ہے وہ شوخ
کچھ اگر حسن کا دعوٰے ہے تو باہر آؤ

اس قسم کے صدہا شعر منتخب کیے جا سکتے ہیں ✤ کوئی غزل اس تازہ گوئی سے محروم نہیں رہی اب تازہ تشبیہات اور دلچسپ تمثیلوں کو ملاحظہ فرمائیے ________

نہ ہوگا بند جب تک نقدِ جاں باقی ہے قالب میں
سخی کے گھر کا دروازہ ہے چاک اپنے گریباں کا

اس تشبیہہ کی جدّت اور بلاغت کا کیا کہنا۔ داد دینے کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے کمال فن اور سحر گفتاری کا اندازہ کرنے کے لیے یہی ایک شعر کافی ہے۔ پورا دیوان ایک طرف اور یہ شعر ایک طرف ________

سروِ گل سے تمہیں تشبیہہ کب دیتا ہوں
لال آنکھیں نہ کرو آگ بگولا ہو کر

اس سخن اور اس نئے اسلوب بیان کو دیکھیے تشبیہہ سے انکار بھی کیا جاتا ہے اور پھر ایک نہیں دو دو تشبیہیں انکار کے پردے میں پیش کی جاتی ہیں۔

حسد سے طرّۂ مضموں مرا یگانہ ہوا
عدو کے خندۂ دنداں نما سے شانہ ہوا

جب بلندی پر پڑے دیکھے کہیں مہوے کے پھول
ڈھیر سمجھے ہیں کسی بادہ کشِ مغفور کا

* * *

دل مرا کشتہ ہے یارب کس شہادت گاہ کا
ہر شگافِ زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا

* *

تو یہ کرتی تھی کہ بہ چھاڑ ملالت کی ہوتی
خوب ہی مجھ پر برستے ہوئے بادل آتے

* * *

نہیں ہے مہر لفافہ پہ خط کے اے قاصد
یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا

* *

باغ سے ہم کو نکالا تو ہماری آنکھیں
رہ گئیں رخنۂ دیوارِ گلستاں ہو کر

* * *

جل گیا اُگتے ہی دانہ جو میری قسمت کا
آسیا رہ گئی انگشت بدنداں ہو کر

* *

یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجنوں
نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلا ہے محمل میں

* *

جان جاتی ہے خیالِ عارضِ پُرنور میں
ڈوبتی ہے میری کشتی چشمۂ کافور میں

×

جس پری کی آنکھ مجھ سے پھر گئی بولا جنوں
لو مبارک اور اک حلقہ بڑھا زنجیر میں

×

وقتِ فرصت تھا مِری عبرت کدۂ ہستی میں
کفِ افسوس ملی جس نے کیا گم مجھ کو

مذکورہ بالا شعر میں تشبیہ کی جدت کے علاوہ اعزازِ نفس کتنا شاندار ہے ——

بیڑیاں دیوانۂ گیسو کو پہناتے ہو کیوں
رشتۂ الفت کا پھندا سخت ہے زنجیر سے

حسن التعلیل اور مذہب الکلامی کی بھی اچھی اچھی مثالیں بہت سی غزلیات میں ملتی ہیں جذباتی شاعری سوز وگداز نسبتاً کم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون آفرینی اور تازہ گوئی پر توجہ مبذول کی گئی ہے۔ پھر بھی ایک غزل میں ایک ایک دو دو مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً ——

بات رکھ لی مری قاتل نے گناہ گاروں میں
اس گناہ پر مجھے مارا کہ گناہگار نہ تھا

×

غم اُٹھانے کو بہت تھے ترے بندے یارب
کیا کمی تھی اگر اک مجھ کو نہ پیدا کرتا

تم کو پھولوں کی چھپر کھٹ ہمیں کانٹے ہیں نصیب
خیر قسمت وہ تمہاری ہے یہ تقدیر اپنی

پھینک دوں کاٹ کے جڑ نخلِ تمنا کی امیر
پھول کم بخت میں آئے نہ کبھی پھل آئے

اتنی نسبت بھی کفایت ہے یہاں بخشش کو
کاش وہ اپنا گنہ گار ہی جانے ہم کو

تیر پر تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

نہ عنایت نہ تلطف نہ مروت نہ وفا
تمہیں کہہ دو کہ رہے پھر کوئی کس کا ہو کر

بعض اشعار میں چند الفاظ کا حذف وجدانی کیفیت رکھتا ہے ——

دوزخ میں مجھ کو پھونک چکے تھے مرے عمل
قربان شانِ رحمتِ پروردگار کے

حلقۂ زلف میں پھنس کر کوئی نکلا ہے کبھی
موت کے منہ سے چھڑایا ہے قضا نے ہم کو

اس شعر کو پڑھ کر حضرت داغ کا یہ مطلع جو بالکل اسی انداز میں اور حذف کے لحاظ سے بھی اسی رنگ کا ہے۔ یاد آجاتا ہے ـــــــ

جا کہ اس کوچے میں آجاتی ہے شامت کیسی
مرے اللہ نے رکھ لی مری عزت کیسی

ادا نے ہم کو قضا نے ہم کو اس زمین میں ایک اور شعر اسی قبیل سے ہے ـــــــ

آس کس کو تھی شبِ غم کی سحر ہونے کی
اے بتو دن یہ دکھایا ہے خدا نے ہم کو

نگہہ مہر کہاں یارِ جفا پیشہ کہاں
ملک الموت سے ہے چشمِ ترحم مجھ کو

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں حذف کا لطف قابل داد ہے۔ اس حذف کا کیا کہنا جو صراحت سے بھی زیادہ واضح ہو۔ غرض استادانہ شان اور شاعرانہ عظمت کی کون سی خوبی ہے جو پورے جاہ و جلال سے ان کے کلام نظر آتی ہے۔ ایسے باکمال استاد پر خدائے سخن کا لقب پوری مناسبت رکھتا ہے۔ کہاں تک انتخاب کیا جائے ہر ایک شعر میں یہ عالم ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

مگر فصاحت و بلاغت کے اس دریائے بے پایاں میں لفظی اور معنوی تکلفات اور استعارہ در استعارہ کے گرداب بھی جا بجا

نظر آتے ہیں۔ جس طرح متاخرین فارسی نے جدت طرازی کے شوق میں رنگین بیانی اور خیال بندی کے طلسم بنائے۔ متاخرین اردو نے بھی انہیں کی تقلید میں اسی راہ پہ چلنا شروع کیا۔ ان پیچ در پیچ استعاروں کا سلسلہ آتش اور ناسخ کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ آتش ایک جگہ فرماتے ہیں ——

فصلِ گل ہے چار دن ساقی تکلف ہے ضرور
پر جواہر کے بطِ مے کو لگایا چاہیئے

دلی والوں میں مومن نے کسی حد تک اور غالب نے آخری حد تک یہی رنگ قبول کیا۔ لکھنؤ میں بھی اس کا اثر کم نہ تھا۔ وہاں بھی نوابوں اور امیروں کے صحن میں آبِ گوہر کا چھڑکاؤ ہونے لگا تھا۔ حضرت امیر بھی اسی رو میں بہتے رہے چونکہ خیال بندی کے ان طلسمی مضامین میں حقیقت پسندی کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس لیئے زمانہ حال کا مذاق سخن اس قسم کی رنگینی کلام اور اس قسم کے لفظی و معنوی تکلفات کو گوارا نہ کر سکا۔ اہل لکھنؤ نے ان معنوی تکلفات کے ساتھ صنائع لفظی کی بھی اتنی بھرمار کر دی کہ صنائع کے الفاظ شعر کا ضروری عنصر ہو گئے۔ تکلفات کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں وہ غم دوست ہوں تجویز کی غم سے دوا غم کی
جو آیا منہ چبالی چھالیں میں نے نخلِ ماتم کی

* * *

منا ہی کو چہرۂ محبوب میں ہے نالۂ غم کی
غضب ہے اب تو وہ جڑ کاٹتے ہیں نخلِ ماتم کی

ہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاشِ بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل کی

نہال اس کو ہمیشہ کرتی ہے بالیدگی غم کی
الہی دل ہے یا کوئی کلی ہے نخلِ ماتم کی

عشقِ ابروئے بتاں میں دل نے کی ایسی طپش
زلزلہ آیا زمینِ کوچۂ شمشیر میں

کشت و خوں ایسا ہی رہتا دورِ ترکاں میں اگر
روندِ عزرائیل پھرتے کوچۂ شمشیر میں

عشقِ ابرو میں جو چلاتا ہوں کہتا ہے وہ ترک
کون دیتا ہے دہائی کوچۂ شمشیر میں

چوری ہے کب ثبوت مرے نقدِ ہوش کی
مفتیِ شہر قطع نہ دست سبو کریں

مگر حق یہ ہے کہ دست سبو کے مضمون میں ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر آغا کا یہ شعر اپنا جواب نہیں رکھتا۔

ہوں وہ مےکش جب نہ آیا میکدے میں ایک دن
ہر سبو نے ہاتھ پھیلائے دعا کے واسطے

ان تکلفات کی کچھ اور مثالیں ملحوظ ہوں۔

اپنی وحشت سے ہے روشن خانۂ زندانِ غم
مردمک ہے پاؤں اپنا دیدۂ زنجیر میں

ہوں زار اس قدر کہ تری جلوہ گاہ میں
چھپ جاؤں گا میں پردۂ گردِ نگاہ میں

⁘

سینۂ قاتل سرِ بسمل پہ خنداں زخم تن
کیا اگا ہے نخلِ ماتم تھیے دیوار پر

⁘

مصرعہ اول میں جس تصنع سے کام لیا گیا ہے اس مضمون میں اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔

امید قتل ترکِ چشم سے کچھ کچھ تو پڑتی ہے
بڑھا کر دستِ مژگاں رکھ دیا ہے تیغ ابرو پر

اس شعر میں بھی مصرع ثانی پر تصنع کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

مر گیا ہوں الفتِ قامت میں آہیں کھینچ کر
شامیانہ ہو مرے مرقد پہ قد آدم کا

ہوا یہ کس قد موزوں کا باغ میں جلوہ
کہ تنگ قافیہ ہے مصرعِ صنوبر کا

مل گیا بوسہ جو اس عارض پر نور کا
ہم یہ سمجھے پھول ہاتھ آیا نہالِ طور کا

تھا کسی ابروئے خم دار کا یہ انتظار
دیدۂ جوہر میں اٹکا آکے دم شمشیر کا

اس شعر میں مصرع اوّل تصنع کے بوجھ سے پوری طرح دبا ہوا نظر آتا ہے۔ لفظ انتظار نے اس تصنع کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ مصرعِ ثانی میں استعاروں کے پیچ نے شعر کو ایک ہوائی قلعہ بنا دیا ہے۔

حلقۂ گیسو میں پائی نقدِ دل دے کر جگہ
دیدیا پہلے کرایہ خانۂ زنجیر کا

ظالموں کو بھی ہوا ماتم ترے نخچیر کا
روتی ہے مُنہ پر کماں رکھ رکھ کے پلّہ تیر کا

اے معلم تیز ہے اس طفل کی تیغِ نگاہ
دیکھ ہو جائے نہ بسمل مرغ بسم اللہ کا

٭ ٭ ٭ ٭

پیاسا ہوں اس قدر کہ مرا دل جو گر پڑا
پانی ابل کے چاہِ ذقن سے نکل گیا

٭

اسے کہتے ہیں پاسِ رازِ الفت دیکھ اے قاتل
سیا ہے منہ ترے تارِ کمر سے زخمِ پنہاں کا

نہ بھولے آپ کو بھولے جو دُنیا کو تو کیا بھولے
یہ منت ہو اگر پوری تو بھریے طاق نسیاں کا

ان اشعار میں نخلِ ماتم کی چھال اور پھر مُنہ آنے پر اسے بطور دوا چبانا جوہرِ شمشیر کو مچھلی کہنا اور آبِ تیغ دریا مان کر اور پھر ان کے لیے لفظ نہال بطور ضلع استعمال کرنا۔ نخل ماتم کی

جڑ بھی فرض کر لینا اور پھر اس جڑ کو کاٹ رکھ دینے کا خیال۔ کوچہ شمشیر میں زلزلہ پیدا کرنا۔ اس کوچے میں دہائی دینا اور وہاں عزرائیل کا روند پھرنا۔ دست سبو کو بطور سزا کاٹنا۔ پاؤں کو دیدۂ زنجیر کی پتلی کہنا خانۂ زنجیر کا کرایہ ادا کرنا۔ گردِ نگاہ کو پردہ قرار دینا اور خود اس پردے میں چھپ جانا۔ دیوار قہقہہ پر نخل ماتم کا اگنا۔ دستِ مژگاں کو بڑھانا اور بڑھا کر تیغ ابرو کی باڑھ دیکھنا۔ مدِ آہ کو شامیانہ کہنا صنوبر کو مصرع کہہ کر اس مصرع کا قافیہ تنگ کرنا۔ نہال طور کے پھول توڑنا۔ شمشیر کے دم کا دیدۂ جوہر میں اٹک جانا۔ تیر کے پلے کو منہ پر رکھ کمان کا رونا۔ بسم اللہ کے مرغ کا بسمل ہونا۔ چاہ ذقن سے پانی ابل ابل کر نکل جانا اور پھر اس پانی سے دل کی پیاس بجھانا۔ محبوب کے تار کمر سے زخم پنہاں کا منہ سی دینا۔ طاق نسیاں کو بھرنا وغیرہ حضرت امیر کی خیالی طلسم بندیوں اور ہوائی قلعوں کے چند نمونے ہیں جن کا تتمہ ان کے شعر مندرجہ ذیل کو کہنا چاہیئے۔

تم شہسوار حسن ہو لگ جائے گی نظر
گھوڑے سے اترو آنکھ بچا کر رکاب کا

مگر حضرت امیر کا کیا قصور۔ اس زمانہ کا مذاق سخن اس قسم کے مضامین اور تکلفات اور ضلع بندیوں کو جدت طرازی خوش بیانی اور تازہ گوئی قرار دیتا تھا۔ ان کے ہم عصروں کے کلام میں یہ تکلفات بیشتر تو موجود ہیں مثلاً حضرت شمشاد لکھنوی نے اسی عہد میں رکاب کا قافیہ اس طرح لکھا ہے۔

جس کے سوار نے مری مٹی خراب کی
سرمہ ہو میری خاک اسی چشم رکاب کی

ایک اور خیال بند نے شعلہ آواز سے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

باغ میں روشن چراغِ گل ہوا بلبلوں کے شعلۂ آواز سے

اس دور میں آتشِ گل کا دھواں بامِ فلک پر پہنچ رہا تھا۔ اس دھوئیں سے منزل خورشید کی چھت میں کاجل جم جاتا تھا۔ آتش گل سے محبوب کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ جلوہ کی انگلی نقش پا کے کان میں دی جاتی تھی۔ نازک طبع محبوب نخمل ململ کے سائے پر بدست ہو جاتا تھا۔ تیر کے پر کو سرخاب کا پر سمجھا جاتا تھا۔ اسی تازہ گوئی کے جنون میں مومن نے یہ مطلع کہا۔

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمعِ شبستاں ہوں گے

اور مرزا غالب نے تو یہ شعر کہہ کر اس جنون کی تکمیل کر دی۔

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اگرچہ عمر کا بیشتر حصہ حضرت امیر نے انہیں تکلفات میں بسر کیا مگر ان کے ذوقِ سخن صحیح اور مذاقِ سلیم کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ آخرکار انہوں نے اس طلسم بندی اور مجاز نگاری، سے ہوائی قلعہ بنانے کی عادت کو ترک خیال کیا اور ہر قسم کے لفظی و معنوی تکلفات کو چھوڑ کر حضرت داغ کے رنگ میں طبع آزمائی کے جوہر دکھانا پسند کیا۔ اگرچہ اس کوشش میں انہیں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ طبیعت پر جو رنگ غالب آچکا تھا۔ عمر کے

آخری حصّے میں اسے یکدم چھوڑ دینا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تازہ کوشش معقول حد تک بار ور ہوئی۔ جس کا ثبوت ان کا دوسرا دیوان یعنی صنم خانہ "عشق" ہے۔ اور تبصرے کے لیے علیحدہ مضمون کا تقاضی ہے۔

زبان کی بے تکلفی بیان کی صفائی مضامین کی سادگی اور جذبات نگاری کے لحاظ سے اس دوسرے دیوان کو بھی سلاستِ کلام کا بہترین نمونہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس میں سے دو تین شعر ہی یہاں بطور نمونہ کافی ہوں گے۔

دن مرا روتا ہے میری رات کو
رات روتی ہے مری دن کے لیے

پھر بہار آئی ہے شاید باغ میں
بلبلوں نے چونچ میں تنکے لیے

سب حسین زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے

عاشقوں سے گرچہ مطلب کچھ نہیں
آپ پھر پیدا ہوئے کس کے لیے

ان کا تیسرا کلام نعتیہ ہے۔ اہل نظر کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ نعت میں اتنا بلند پایہ کلام اُردو کے کسی شاعر نے نہیں کہا اور اس میدان میں کوئی ان کا مدّمقابل نہیں ہے۔ اس دیوان پر بھی کوئی تبصرہ علیحدہ مضمون کا محتاج ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ قصیدہ اور غزل یہ دو اصناف سخن

میں حضرت امیرِ مغفور کا پایۂ شاعری ان کی نعت گوئی کی طرح نہایت ممتاز نہایت گراں قدر اور مستغنی عن التوصیف ہے۔ مرزا سودا کا اگر یہ قول تسلیم کر لیا جائے کہ پورا شاعر وہی ہوتا ہے جو اچھا قصیدہ کہہ سکے تو حضرت امیر کی اُستادانہ عظمت اور بھی زندہ جاوید ہو جاتی ہے اور وہ بلاشبہ خدائے سخن کہے جانے کے مستحق ثابت ہوتے ہیں۔

* * *

دلؔ شاہجہانپوری

اگرچہ حضرت دلؔ نے اپنے دیوان میں جس کا نام نغمۂ دل ہے رنگِ قدیم اور رنگِ جدید کو الگ الگ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بقول حضرت نیازؔ فتحپوری قدیم و جدید میں کوئی امتیاز کرنا بہت دشوار ہے۔ قدیم کو قاف اور جدید کو جیم لکھ دینے کی بجائے اگر ہر غزل کے ساتھ سنہ تصنیف بھی لکھ دیا جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک سالم غزل اپنی مجموعی صورت میں زمانہ حال کی بہترین غزل کا نمونہ اور رنگ قدیم و جدید کے امتیاز سے بالا تر ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سالم غزل اور اس کی مجموعی صورت کو چھوڑ کر رنگ قدیم کی بعض غزلیات میں سے ایک ایک دو دو شعر ایسے انتخاب ہو سکیں جو کسی قدر رنگ قدیم سے منسوب ہوں۔ ورنہ کوئی سالم غزل ایسی نہیں ہے۔ جس پر حرف قاف کا صحیح اطلاق ہو سکے۔ یہ ایک ایک اور دو دو شعر جو رنگ قدیم کی مد میں شمار ہو سکتے ہیں۔ انہیں بھی خالص رنگ قدیم سے منسوب کرنا درست

نہیں ۔ یہ انداز سخن جسے حضرت دلؔ نے رنگ قدیم قرار دیا ہے کب اور کیوں ترک کیا گیا ۔ اس کے متعلق دیوان میں کچھ نہیں بتایا گیا ۔ مگر نغمۂ دل اوّل سے آخر تک دیکھ لینے کے بعد ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذکورہ بالا وجہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ یہاں حضرت دل کی ایک سالم غزل جس کے ساتھ حرف قاف بھی لکھا ہوا ہے درج کی جاتی ہے ۔

کوئی بے کسی میں ایسا نہیں غم گسار میرا
کہ انہیں سنائے اے دل کبھی حال زار میرا

تری ٹھوکروں کو ظالم عبث آج جستجو ہے ۔
جسے کل مٹا چکے ہیں وہی تھا مزار میرا

پس مرگ بھی ہے ظاہر یہ نشان خاکساری
کبھی گرد باد بن کر نہ اٹھا غبار میرا

دل ادھر تڑپ رہا تھا تو جگر ادھر تھا بسمل
کہوں کیا کہ حال کیا تھا شب انتظار میرا

تری تیغ ناز چل کر اسے کچھ تو دے تسلی
کہ بہت تڑپ رہا ہے دل بے قرار میرا

نگہہ ستم کے تیور یہ جتا رہے ہیں اے دل
نہ ہوا کبھی نہ ہوگا وہ ستم شمار میرا

اس غزل کو جسے حضرت دل رنگ قدیم میں شمار کرتے ہیں پڑھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ جناب دل کے خیال میں رنگ قدیم کا مفہوم وہ نہیں جو عام طور پر ان الفاظ سے وابستہ سمجھا جاتا ہے

چھ اشعار ہیں۔ جن میں کوئی شعر ایسا نظر نہیں آتا جو تغزل گوئی کے بہترین معیار سے خارج ہو۔ ہر شعر اُستادانہ انداز سخن کی تصویر، حسن معانی دلکش تصویر جذبات نگاری کی جان اور تغزل کا ایمان ہے۔ اسے رنگ قدیم میں شامل کرنا نہایت ناانصافی ہے۔

یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دل کی ایک اور سالم غزل جسے رنگ جدید کہنا چاہیے اور جو نغمۂ دل میں اس لیے شامل نہیں ہے کہ وہ اس کی اشاعت کے بعد مشاعرہ مصرکی ضلع سیتاپور میں پڑھی گئی تھی بغرض محاکمہ پیش کی جاتی ہے تاکہ صحیح طور پر معلوم ہو سکے کہ حضرت دل کا رنگ قدیم ان کے رنگ جدید بلکہ آج کل کے انداز سخن سے بھی مختلف نہیں ہے اور رنگ قدیم میں بھی حسن تغزل کی وہی شان موجود ہے جو رنگ جدید میں پائی جاتی ہے۔

کبھی ضبطِ سوزِ دل سے کبھی گریۂ فغاں سے
جو شرر اُڑے چمن میں وہ مرے ہی آشیاں سے

دل زار و نالہ کش کو کوئی لائے اب کہاں سے
جو دلیلِ کارواں تھا وہی گم ہے کارواں سے

مرا ہر نفس بیاں ہے مرے اشک ماجرا ہیں
یہی شرحِ مدعا ہیں وہ سنیں جہاں جہاں سے

جو چھپے جگر میں ناوک وہ کھٹک رہے ہیں دل میں
یہ مجھے خبر نہیں ہے ہوئی ابتدا کہاں سے

دلِ زار کو نہ سہنا کبھی شکوۂ تغافل
ابھی آشنا نہیں ہے ترے رازِ امتحاں سے
نہ سمجھ سکے ہم اب تک وہی فیصلہ تھا دل کا
جو کہا تری نظر نے جو سُنا تری زباں سے
مجھے یاد آج تک ہیں وہ ازل کی داستانیں
جو نظر ہے آشنا ہے ترے حسنِ دل ستاں سے
ہوئے بے وجود ہستی نہ مٹی وفا پرستی
کہ ہزاروں گل کھلے ہیں مری خاکِ آشیاں سے
تری بے نیازیوں نے نہ کیے قبول سجدے
یہی داغ تھا جبیں پر جب اُٹھے ہم آستاں سے
کبھی نالہ جنوں ہوں کبھی نغمہ عنادل
بنے سیکڑوں فسانے مری ایک داستاں سے
نہیں امتیاز ناصح تری پندِ بے محل کا
یہ مقام بے خودی ہے مجھے چھوڑ دے یہاں سے

ہمارے فلسفی شعراء جو اپنی مستانہ لغزشوں کی برکت سے نہ صرف دل کی بلکہ اس کی تمناؤں کی گہرائیوں کو ناپتے اور غنائی عصیاں کے گیت الاپتے رہتے ہیں جنہیں چاندنی راتوں میں نہر کا گیت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ جو سیم گوں خاموشیوں کے منظر دیکھتے رہتے ہیں۔ جو بھیگے ہوئے کیف کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں جنہیں جوانی کے سنہری خواب نظر آتے ہیں اور سنہری خواب کی سنہری تعبیر بھی بتاتے ہیں جو اس فردوس کیف زار تمنازاروں

حسرت زاروں اور خدا جانے کن کن زاروں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ جن کی نگاہیں جھڑتے ہوئے کیف اور جھڑتے ہوئے تبسم کو دیکھ سکتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ کیف ریز تبسم ریز اور نوا ریز کی ترکیبیں تراشتے ہیں۔ جو بہترین تنزل کو بھی لکھنویت سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ ریزہ نگار اور زار نویس اگر رنگ جدید کی اس غزل کو بھی جو اوپر درج کی گئی ہے رنگ جدید قرار دیں تو تعجب نہیں۔ ورنہ غزل کی تعریف کو مدنظر رکھا جائے تو حضرت دل کے رنگ قدیم میں بھی ان کے رنگ جدید کے تمام محاسن موجود ہیں۔ نغمہ دل میں کوئی سالم غزل ایسی دستیاب نہیں ہو سکی جس پر صحیح طور سے رنگ قدیم کا اطلاق ہو سکے۔ صرف دو چار غزلیں ہیں کہ ان میں ایک ایک دو دو شعر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ایسے نظر آتے ہیں جنہیں رنگ قدیم کہہ سکیں۔ مثلاً ——

ساقی کی چشم مست نے بے ہوش کر دیا
لینا جناب شیخ چلے آسمان پر

ابرو پہ آئینہ میں نگاہیں ہیں بار بار
برسا رہے ہیں تیر وہ اپنی کمان پر

* *

وقت خود بینی نہ دیکھیں آپ تن کر آئینہ
ہر ادائے حسن پر کھینچے گا خنجر آئینہ

رخ پہ جب لٹکے وہ گیسو اور خوبی بڑھ گئی
ہو گیا ہے بال بڑھ جانے سے بہتر آئینہ

جوڑ اچھا ہے میری تقدیر ان کی زُلف کا
یہ بھی بل کھاتی ہوئی ہے وہ بھی بل کھاتی ہوئی

جو بے تقصیر مارا تھا تو اتنا اور کرم کرتے
انہیں کے ہاتھوں ہماری لاش کی تشہیر ہو جاتی

٭ ٭

لے اُڑیں گی ان بتوں کو شوخیاں
یوں حیا کی پاسبانی جائے گی

٭ ٭

رنگ قدیم و جدید کا جائزہ لینے کے بعد "نغمہ دل" سے متعلق صرف ایک دو باتیں اور ایسی ہیں۔ جن کا بیان کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حضرت دلؔ نے جوہر قابل کی حضرت امیرؔ مینائی کا رنگ سخن کچھ اس طرح جذب کیا ہے کہ ان کے صدہا شعر ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ شعر حضرت دلؔ کا ہے یا حضرت امیرؔ کا۔ مثلاً ـــــــــــ

جو زخم خونچکاں دلِ مضطر کے ہو گئے
جوہر شناس تیغِ ستم گر کے ہو گئے

حسنِ چمن تھے قطرۂ شبنم بہار میں
پلٹی ہوا تو اشکِ گلِ تر کے ہو گئے

ساقی نگاہِ لطف اٹھائے تو کس طرح
کل اہلِ بزم ایک ہی ساغر کے ہو گئے

آہیں شریکِ درد ہیں کس کی شبِ فراق
نالے تو ہم نوا دلِ مضطر کے ہو گئے

یوں وقفِ دیر و کعبہ رہے ہم حبابِ دلؔ
اس گھر کے ہو گئے کبھی اس گھر کے ہو گئے

اُستاد کا تتبع ہر شاگرد کا فرض ہوتا ہے مگر تتبع کو اس حد تک پہنچا دینا کہ کامل طور سے اُستاد کا رنگ منظمن جذب کر لیا جائے ہر شاگرد کا کام نہیں۔ مرآۃ الغیب میں حضرت امیرؔ مغفور کی وہ غزلیں ملاحظہ ہوں جن میں ابد کی زمین خنجر میں رہ گئے محشر میں رہ گئے اور دوسری کرنماں میں رہ گئے زنداں میں رہ گئے ہیں اس کے بعد حضرت دلؔ کی یہ غزل جس کے چند شعر اُوپر درج کئے گئے ہیں۔ پڑھی جائے تو حضرت دلؔ کی قوتِ جاذبہ کا اعجاز صاف طور سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہاں ان ہر دو غزلیات کا اقتباس اس لیے درج نہیں کیا گیا کہ اپنے کلام کے ساتھ حضرت امیرؔ کا کلام بطور مقابلہ درج کرنا حضرت دلؔ کو ضرور ناگوار ہوگا۔

دوسرا نکتہ قابل غور یہ ہے کہ متروکات زبان اور متروکات شعری کے لحاظ سے حضرت دلؔ کی زبان ان شعراء کے لیے جو اہلِ زبان نہیں ہیں۔ بلاشبہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ ان متروکات کو جن کا مختصر بیان حضرت دلؔ کے قلم سے اسی نمبر میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ماننے کو تو سب فصحاء مانتے ہیں۔ بلکہ اس بحث میں حضرت دلؔ سے بھی کچھ پیش پیش ہیں مگر میدان عمل میں آکر وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات تو نہیں البتہ بعض اوقات کوئی نہ کوئی متروک لفظ استعمال کر جاتے ہیں۔

متروکات کا نہایت سختی سے پابند ہونا اور ان کے عدم استعمال سے کبھی غافل نہ رہنا یہ وصف یا تو ہم نے جناب نوحؔ ناروی میں دیکھا ہے یا جناب دلؔ میں ورنہ بیشتر فصحائے زمانۂ حال جو اپنی حاصل کردہ شہرت و عظمت کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ ان متروکات کی پروا نہیں کرتے اور یاں واں تلک لے کہیں مردن پس از مردن و لیکن گرچہ تخفیف حروف علت وغیرہ اب تک استعمال کیے جاتے ہیں خرابی یہیں تک محدود نہیں۔ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ان متروکات کے استعمال پر زور دیتا اور اس کے جواز پر اصرار کرتا ہے۔ جب اہل زبان کا یہ حال ہے تو زبان دانوں کو ان پر توجہ دلانا اور ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ متروکات کے پابند ہوں فضول اور بیکار ہے۔ پنجاب کے اہل قلم متروکات کو جاننے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے۔ طرہ اس پر یہ ہے کہ ان کی فرعونیت اہل زبان کی تقلید سے اس قدر سرکشی اختیار کر رہی ہے کہ متروکات کا پابند ہونا تو درکنار وہ روزمرہ کی غلطیاں بھی اپنے تصرفات سے منسوب کرتے اور انہیں جائز و برحق سمجھتے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک پروفیسر صاحب کی ایک اردو نظم جس کا عنوان ہسپانوی عورت تھا ہمیں بغرض اشاعت موصول ہوئی اس نظم میں ٹیپ کا شعر یہ تھا۔

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہو تو کر میرے لیے

یہ نظم کسی انگریزی نظم کا ترجمہ تھی۔ ٹیپ کے مصرع میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد اسے شائع کر دیا گیا۔ ترمیم یہ تھی۔

تجھ کو اُلفت مجھ سے کرنی ہو تو کر میرے لیے

کچھ عرصے بعد لاہور کے رسالہ کارواں میں جو صرف سالانہ نمبر کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔ یہی نظم پھر شائع ہوئی۔ اس بار اشاعت میں ٹیپ کا مصرع اپنی اصلی صورت ہی میں تھا۔ بعض اصحاب نے اس مصرع کی زبان پر اعتراضات بھیجے۔ چونکہ یہ اعتراضات اہلِ زبان کی طرف سے تھے۔ انہیں بے چوں وچرا تسلیم کر لینا مناسب تھا مگر ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب کہ ہم نے اگلے سال کے کارواں میں ان اعتراضات کی تردید پڑھی اور زبان کے اس فاش سقم کو پنجابیوں کے تصرفات کی آڑ میں پناہ دی گئی۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب اہلِ زبان کے روز مرہ سے سرکشی اور تمرد کی یہ صورت ہو تو متروکات زبان کی پروا کرنے اور ان پر سختی سے پابند ہونے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں جب کہ نہ اہلِ زبان صحت زبان کی پروا کرتے ہیں اور نہ زبان دان۔ حضرت دل کی شستگی زبان سے صحت زبان کے ہر طرفدار کو خاص مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ہم بیانگ دہل یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ متروکات زبان کی انتہائی پابندی کے لحاظ سے فصحائے لکھنؤ میں حضرت دل اور فصحائے دہلی میں حضرت نوح صحت زبان کے علمبردار ہیں۔

غزل کی ان دو خصوصیتوں کے علاوہ محاسن کلام کے اور بہت سے پہلو ایسے ہیں جو حضرت دل کے لیے سرمایہ افتخار ہو سکتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے دیگر اصناف سخن کا مذکور بھی

لازم ہے۔ تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ موصوف کا کمال سخن صرف غزل ہی تک محدود نہیں۔

"نغمۂ دل" میں مجموعہ غزلیات کے بعد جسے صفحہ ۱۷۴ پر ختم کیا گیا ہے بیس بائیس صفحات اور بھی ہیں جس میں ۲۵ رباعیات چار نمسے اور دو ترجیع بند ہیں۔ سب سے پہلے ہم رباعیات پر متوجہ ہوتے ہیں۔

شاعر جو امیرؔ کی عنایت سے ہوئے
وہ رب قدیر کی عنایت سے ہوئے
جز فکر سخن فکر نہیں کچھ ان کو
آزاد اسیرؔ کی عنایت سے ہوئے

عالم سے جدا ہے مے پرستی میری
صرف مے و مینا ہوئی ہستی میری
صد شکر گرا تو پائے ساقی پہ گرا
گردوں سے بلند تر ہے پستی میری

یہ دونوں رباعیاں حسن بیان کی تصویر اور اُستادانہ انداز سخن کے لیے سرمایہ توقیر ہیں۔ پہلی رباعی اتنی لمبی ردیف کے باوجود اس قدر کامیاب ہے کہ باید و شاید۔ چوتھا مصرع رباعی کی جان ہوا کرتا ہے۔ ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ اللہ کتنا بے پناہ مصرع کہا ہے۔ "آزاد اسیرؔ کی عنایت سے ہوئے

اس کی داد کہاں تک دی جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دل کو بیٹھے یہی مصرع جس کے الہامی ہونے میں شک نہیں سوجھا ہے۔ اور اسی بنیاد پر اس رباعی کی تعمیر اٹھائی گئی ہے۔ مصرع ثانی میں ردیف کی معنوی عظمت مصرع اوّل سے خراج تحسین طلب کر رہی ہے۔ مصرع سوم میں نکتہ سخن اور فکر دنیا میں جو لطیف اور معنوی فرق حقیقی و مجازی استعمال سے ظاہر ہوا ہے وہ بھی قابل داد ہے۔

دوسری رباعی میں پستی کو بلندی اور وہ بھی گردوں سے بلند ہی نہیں بلکہ بلند تر ثابت کرنے کی کوشش کتنی کامیاب مدعا ہے۔ یہ مصرع بھی بلند خیالی کی معراج ہے اور اس پر جو مصرعے لگائے گئے ہیں۔ ان سے بہتر اور کوئی صورت خیال میں نہیں آسکتی۔

مقبولِ زمانہ وہ بشر ہوتا ہے
جو خاکِ سرِ راہ گذر ہوتا ہے
پستی کا عبث شکوہ ہے تجھ کو غافل
ہر بحر میں تہ نشین گہر ہوتا ہے

۴

صد حیف کہ اک پیکر حیرانی ہوں
ذروں کی طرح حرفِ پریشانی ہوں
اے اہلِ نظر دیکھو حقیقت میری
موجود ہوں عالم میں مگر فانی ہوں

عجز و انکسار کی فضیلت میں شعرائے کرام نے بہت کچھ کہا ہے مگر حضرت دلؔ نے جو گوہر بے بہا ڈھونڈا ہے۔ اسے حاصل ہفت قلزم کہنا چاہیئے بحر کی جگہ ہر بحر کہنے سے استدلال کو جو تقویت حاصل ہوتی ہے وہ اور بھی مستحسن ہے۔ دوسری رباعی میں پیکر جوانی وحیرانی اور صرف پریشانی کی وسعت لینی کے علاوہ لفظ حقیقت کو مجاز کے معنی میں جو استعمال کیا ہے وہ بہت پر لطف اور نہایت بلیغ ہے۔ اہل نظر کو مخاطب کرنا بھی لفظ دیکھو کی مناسبت سے لفظاً اور لفظ حقیقت کے لحاظ سے معناً نہایت قابل داد ہے۔

لبریز فنا عمر کا پیمانہ ہے
ہر ہر نفس سرد ایک افسانہ ہے
دنیاوی نظروں میں ہے فانی اے دلؔ
باقی جو سمجھتا ہے وہ دیوانہ ہے

عمر انسانی پر موت کی زد اس قدر زیادہ ہے کہ عمر کا پیمانہ اسی زہراب سے بھرا ہوا سمجھو۔ مصرع اوّل کا ترجمہ تو یہی ہے مگر الفاظ "بھرا ہوا" میں وہ لطف کہاں جو لبریز فنا کی ترکیب میں ہے۔ مصرع ثانی میں ہر ہر کی تکرار بہت بلیغ ہے۔ یہاں ہر ایک نفس بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر ہر ہر نفس میں اور ہی عالم نظر آتا ہے۔ نفس سرد کو ایک افسانہ کہنا تمام واقعات زندگی کو دو تین لفظوں میں بند کر دیتا ہے۔ الفاظ میں بہت معنوی وسعت دونوں مصرعوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

مِل جُل کے رہو اہلِ وطن مرد بنو
تنظیم کے میدان میں تم فرد بنو
معراجِ کمال پاؤ جمعیت سے
منظور اگر تفرقہ ہو درد بنو

٭ ٭

پہنچا چمنِ دہر میں پیغامِ بہار
ہے جام بہ کف ساقیِ شیریں گفتار
مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں شاخیں
اب سبزۂ خوابیدہ بھی ہو گا بیدار

٭ ٭

کیا کیا گلۂ بے سروسامانی ہے
قصہ دلِ ناکام کا طولانی ہے
طے کرتا ہوں یوں دشتِ جنوں کی راہیں
پیچھے میرے گرد آگے پریشانی ہے

٭ ٭

دل حسن کے پرتو سے اک آئینہ ہے
گنجینۂ معرفت میرا سینہ ہے
مانوسِ تجلّی ہوں ازل سے اے دلؔ
احساسِ حقیقت مجھے دیرینہ ہے

اس انتخاب سے ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت دلؔ کی رباعیات کس پائے کی ہیں اور ان کی طبیعت غزل کی طرح

رباعی کہنے پر کس قدر حاکمانہ قدرت رکھتی ہے اب تخمیس کا تھوڑا سا اقتباس درج کرتے ہیں۔

"نغمۂ دلؔ" کا چوتھا خمسہ حضرت دلؔ نے اپنی ہی غزل پر کہا ہے اس کے دو تین بند ملاحظہ ہوں۔

اس غزل کا مطلع یہ تھا۔

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا
دل کی بربادی کے بعد ان کا پیام آیا تو کیا

اس مطلع کی تخمیس میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

کوچۂ جاناں سے پیکِ خوش خرام آیا تو کیا
اب جو راحت بخشنے والا کلام آیا تو کیا
اس کی یاد آئی تو کیا خط اس کے نام آیا تو کیا
مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا
دل کی بربادی کے بعد ان کا پیام آیا تو آیا

دوسرا شعر یہ تھا

کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے
اب سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا

اس شعر کی تخمیس حسب ذیل ہے۔

شرقِ پامالی میں طرزِ فتنہ پرور دیکھتے
دل کی بربادی کا عالم اس کے در پر دیکھتے
کچھ تو انجامِ محبت خاک ہو کر دیکھتے
کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے

اب سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا

تیسرا شعر یہ تھا ـــــــــــ

تیرگیِ بختِ عاشق بڑھ گئی شامِ فراق
چرخِ نیلی فام پہ ماہ تمام آیا تو کیا

اس شعر کی تخمیس بھی ملاحظہ ہو۔

عشق سے پہلے سُنا کرتے تھے ہم نامِ فراق
دل لگانا تھا مگر تمہیدِ پیغامِ فراق
یہ شب یہ سماں اس پر یہ آلامِ فراق
تیرگیِ بختِ عاشق بڑھ گئی شامِ فراق
چرخِ نیلی فام پہ ماہ تمام آیا تو کیا

خمسہ میں سب سے زیادہ قابلِ غور یہ پہلو ہوتا ہے کہ لگائے ہوئے مصرعوں کا ربط اصل شعر سے اس قدر مضبوط ہو کہ مفہوم کی تشریح کے لیے انہیں ایک جزو لاینفک ماننا پڑے۔ تینوں شعروں کی مذکورہ الصدر تخمیس میں یہ وصف اس قدر نمایاں ہے کہ نئے مصرعے اصل شعر سے بلحاظ ربط کلام دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ہر ایک بند میں یہ حسن یہ برجستگی اور یہ خوبی پیدا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس میدان کا شہسوار وہی ہو سکتا ہے جس کی مشق سخن منتہائے کمال کو پہنچ چکی ہو۔

تخمیس کے یہ تین نمونے پیش کرنے کے بعد ہم حضرت دل کے مجموعۂ نظم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

نظموں کا جو مجموعہ اس تبصرہ کے لیے موصول

ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت دلؔ کی نظمیں صرف مقامی اور تقریبی ہیں۔ تاریخی ادبی اخلاقی قومی ملکی اور مزاحیہ عنوانوں یا جذبات و مناظر پر کوئی نظم ان میں شامل نہیں۔ ہنگامی نظمیں کہنے والے شعراء اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مقامی حیثیت کی تقریبی نظمیں زیادہ تر دفع الوقتی کے خیال سے کہی جاتی ہیں۔ احباب کے اصرارِ پیہم سے تنگ آکر عموماً بیگار ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں شاعری کا عنصر بہت کم ہے۔ بلکہ برائے نام ہوتا ہے۔ جھوٹی مدح سرائی انہیں اور بھی بے کیف بنا دیتی ہے۔ فرمائش کرنے والے اصحاب شاعر کو ایک مشین سمجھ لیتے ہیں۔ اور انعقاد جلسہ سے چند گھنٹے پیشتر شاعر کو اطلاع دیتے ہیں اور نہایت فصیح و بلیغ نظم کہنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ بے چارہ شاعر اگر تنگیٔ وقت کی شکایت کرتا ہے تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ پندرہ بیس شعر کہہ دینا کون سی بڑی بات ہے یہ تو آپ کا پانچ منٹ کا کام ہے۔ اگر کسی غم و الم یا کسی مریض کی تیمارداری یا کسی سانحہ کی وجہ سے یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس وقت طبیعت حاضر نہیں ہے براہ مہربانی مجھے معاف کیجیے تو یہ حضرات شاعر کو بے لحاظ سمجھ کر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں اگر طوعاً و کرہاً ان کی فرمائشیں مان لی جائے تو یہ ان کی بد ذوقی اور کور سوادی عجیب و غریب پابندیاں عاید کرتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ صاحب بہادر کا نام معہ خطابات و القاب نظم میں آ جائے ان کی لیڈی کا نام بھی آ جائے۔ نئے صاحب بہادر جو تشریف لا رہے

ہیں۔ دو تین شعر ان کے لیے بھی مخصوص ہوں۔ ان کا نام نامی بھی مع ان کے خطاب و القاب کے ضرور آجانا چاہیئے۔ ان کی لیڈی کا نام بھی ضرور آنا چاہیئے۔ داعیان جلسہ میں سے فلاں فلاں صاحب کا نام اظہار عقیدت کی صورت میں ضرور آئے۔ صاحب بہادر نے کھیتوں کی منڈیں دیہات میں بہت کوشش سے بندھوائی ہیں۔ پلیگ کے دنوں میں رعایا کی جانیں بچانے کے لیے ان کی مسیحا نفسی نے لاکھوں چوہے ہلاک کیے ہیں۔ ان کارناموں کا بھی ذکر ہونا چاہیئے اشتمال اراضی اور کواپریٹو سوسائٹیوں کو ان کے عہد معدلت میں جو روز افزوں ترقی ہوئی ہے وہ بھی ہے وہ بھی بیان کر دی جائے۔ سیاسی شورش و شر کو دبانے کے لیے انہوں نے نہایت تدبر کا ثبوت دیا ہے۔ اور اپنے آہنی پنجے سے اس جد و جہد کا گلا گھونٹ کر مستقل امن قائم کیا ہے۔ یہ شاہکار بھی اس نظم میں مذکور ہوں۔ اب فرمایئے کہ بے چارہ شاعر کس کس حکم کی تعمیل کرے۔ مختلف جنس کے چھ سات نام کسی ایک بحر میں آ ہی نہیں سکتے۔ انگریزوں کے بعض نام ایسے ہوتے ہیں جو باعتبار صحت تلفظ کسی بحر میں بھی نظم نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی ہمت والا اس ہفت خواں کو طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو باقی ماندہ فرمائشوں کی تعمیل میں کیا کرے۔ معلوم نہیں یہ حضرات شاعر کو کیا سمجھتے ہیں۔ جس میں نظم ساؤنڈ ڈکراتے ہوں۔ اونٹ بڑاتے ہوں۔ چوہے دم توڑ رہے ہوں۔ وہ نظم نہیں ہوئی اچھا خاصا وحوش خانہ ہوا۔ طرہ اس پر یہ کہ اس قسم کے جلسوں میں حکام کا رعب اس قدر طاری ہوتا ہے کہ ریڈیو کا نام سن

گر شاید کچھ داد مل جائے۔ وہ بھی تالیوں کی صورت میں، ورنہ نظم پڑھنے والا یہی محسوس کرتا ہے کہ تمام حاضرین کو سانپ سا سونگھ گیا ہے۔ یہ وہ وجوہ ہیں جو تقریبی نظموں کو بالکل ناکارہ اور مستقل شاعری کے دائرے سے خارج کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی صدہا نظموں میں بمشکل تمام دو تین نظمیں ایسی نکلیں گی جو کسی ادبی معیار کے مطابق ہوں اور جن میں شاعرانہ انداز بیان غالب نظر آئے۔ مقام مسرت ہے کہ حضرت دلؔ کی تقریبی نظمیں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں اور اس کی وجہ فن شعر میں ان کی مہارت تامہ، ان کی مشقِ سخن ان کا ذوقِ سلیم اور وجدان صحیح ہے۔ انہیں اوصاف کی برکت ہے کہ پھیکا شعر ان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتا۔ طبیعت ہے کہ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ ہر چمن میں شگفتہ رہتی ہے ہر جگہ اپنی بہار دکھاتی ہے اور کسی عالم میں اپنا قدرتی رنگ نہیں چھوڑتی۔ یہاں ان نظموں کے بعض حصے ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ کلکٹر ضلع شاہجہانپور کی تبدیلی پر حضرت دلؔ نے ایک نظم ۷ مارچ ۱۹۳۴ء کو الوداعی جلسے میں پڑھی تھی۔ اس کا ابتدائی حصہ محاسن کلام کی دولت سے مالا مال ہے۔ شروع کے چار بند حسب ذیل ہیں۔

آج ہم رودادِ بختِ نارسا کہنے کو ہیں

انقلاباتِ جہاں کا ماجرا کہنے کو ہیں

چند آنسو ہیں جو اپنا مدعا کہنے کو ہیں

کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے کیا کہنے کو ہیں

یہ خبر اب تک کسے تھی کیا سے کیا ہو جائے گا

نغمۂ دلکش مقدر کا گلہ ہو جائے گا

منظرِ رنج و قلق ہے کس لیے چشم پر آب
آج قلب مطمئن کو کیوں ہے اتنا اضطراب
دے دیا صبر و تحمل نے یکایک کیوں جواب
شادماں افسردہ خاطر ہیں یہ کیا ہے انقلاب
روح پرور ہر ترانہ نالۂ دل بن گیا
دفعتاً عشرت کدہ کیوں یاس منزل بن گیا

*　*

کیا صدا کانوں میں آئی ہے کہ دل مغموم ہے
ضبط رخصت ہو گیا تسکین بھی معدوم ہے
شوخیٔ قسمت سے ہر امید اب مرحوم ہے
لوحِ پیشانی پہ افسردہ دلی مرقوم ہے
کیوں نظر آتی نہیں افسردگی ٹلتی ہوئی
جس سے ہو تسکینِ خاطر وہ ہوا چلتی ہوئی

*　*

کوئی بے رونق پھلے پھولے چمن کو کر چلا
دامنِ گل جائے شبنم آنسوؤں سے بھر چلا
وائے حسرت جو نہال آیا بہ چشمِ تر چلا
چاندنی پھیکی ہے نظروں میں مہرِ انور چلا
کس کی رخصت آن واحد میں قیامت ڈھا گئی
نو شگفتہ غنچۂ دل پر اداسی چھا گئی
اسی طرح ایک نہایت پر لطف نظم بہ انداز غزل ہے جو

. اے این سپرو صاحب کلکٹر شاہجہانپور کی تقریب رخصت پر کہی ہے۔ اس نظم میں غزل کی پوری شان جلوہ گر ہے اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور طبیعت ہے کہ سیر نہیں ہوتی۔ ناظرین پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔

ہے وہم فقط آنا جانا ہے نہ کوئی آتا ہے
دنیا میں بھی ہم سنتے اک آتا ہے اک جاتا ہے

پہلے ہی کسی کے جانے سے کیا ضبط کی بھی ہمت نہ رہی
پھر اشک بہیں گے آنکھوں سے پھر آج یہ دل گھبراتا ہے

وہ لطف کہاں وہ بزم کہاں او ہم سے جدا ہونے والے
پھر ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے پھر درد ہمیں تڑپاتا ہے

ارماں کہاں امید کہاں یہیں سب تھے فقط اک عالم تک
جو نقش تھا اپنی نظروں میں وہ نقش بھی مٹتا جاتا ہے

دستور یہی ہے دنیا کا آئے تھے یہاں جانے کے لیے
بے چین ہو کیوں آنسو پوچھو یہ کون ہمیں سمجھاتا ہے

ڈوبے کہ بچے اب کشتی کو گھبرا کے خدا پہ چھوڑ دیا
ہم روک سکیں ممکن ہی نہیں وہ سیل جو امڈا آتا ہے

وہ شان کرم کا لطف کہاں قاصد بھی کہے اب جا کر
جب یاد تمہاری آتی ہے بے چین کوئی ہو جاتا ہے

ہم غرق تمنا ہونے کو نظارۂ ساحل سمجھے ہیں
اس بحر میں اک اپنا دل ہے جو ڈوب کے راحت پاتا ہے

احباب سے جی بہلانے کو ہم ذکر تمہارا کرتے ہیں
جب رات بھیانک ہوتی ہے ہر سمت اندھیرا چھاتا ہے

آئیں گے بہت آنے والے جائیں گے بہت جانے والے
یا نام خدا کا باقی ہے یا حسنِ عمل رہ جاتا ہے

الطاف میں بھی اخلاص میں بھی مقبول ہوئے سپرو صاحب
جب ذکرِ کرم ہم کرتے ہیں یہ نام زباں پہ آتا ہے

انوار ہو تم تنویر ہو تم اخلاق کی اک تصویر ہو تم
توصیف مسٹر سپرو کے لیے انداز بیاں ڈھل جاتا ہے

اس کس سے کہیں اور کس سے کریں پیکانِ الم کا ہم شکوہ
کاوش ہے کہ بڑھتی جاتی ہے جتنا کہ یہ کھنچتا جاتا ہے

مختار ہیں یہ مجبور ہے دل گریہ کے لیے کچھ قید نہیں
جاتے ہیں اگر ان کی مرضی ہم کو بھی تو رونا آتا ہے

تم شاد رہو آباد رہو دُنیا کو ہمیشہ یاد رہو
یہ نخلِ شرافت کھلتا ہے نیکی کا وہی پھل پاتا ہے

اس مختصر اقتباس سے جو تین چار اصناف سخن کی صورت میں ہے تمام اہلِ ذوق نہایت آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ حضرت دلؔ کی جولانی طبع اگرچہ زیادہ تر غزل ہی کے میدان تک محدود ہے مگر ان کی قادر الکلامی قلمرو سخن میں تمام اصناف سخن پر حکمراں ہے۔ حسنِ طبیعت اور کمال مشق کا صحیح اندازہ کرنے کیلیے بہترین معیار یہی ہے۔ کہ مختلف اصناف سخن میں جوہر طبیعت کی آب و تاب یکساں نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ نہایت پھیکے اور بے لطف عنوانوں کے ماتحت بھی کوئی شعر ایسا نہ نکلے جو حسنِ بیان کے لحاظ سے تہی دامن نظر آئے۔ قادر الکلامی کا یہ نمایاں وصف بہت کمیاب ہوتا ہے۔ حضرت دلؔ کی خوش بیانی اس لحاظ سے غنیمت ہے بقول حضرت داغؔ۔

ایک ہوتی ہے ہزاروں میں طبیعت اچھی

میری رہنما کتابیں

یہ عنوان جب کسی شاعر کے سپرد کیا جائے تو اس کا مقصد یہی
ہو سکتا ہے کہ فنِ شعر اور بلند پایہ ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے
کے لیے اس موضوع کی کون سی کتب قابلِ ترجیح ہیں اور ان
کتب میں کون سی ایسی خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے اسی موضوع
کی دوسری کتب پر انہیں فوقیت حاصل ہے۔

جہاں تک فارسی ادب کا تعلق ہے۔ میں گلستان اور بوستان
کو سب سے زیادہ قابل رہنمائی کہوں گا۔ آج کل ہمارے ترقی پسند دوست
ادب برائے زندگی کو سب سے مقدم اور ادب برائے ادب کو دوسرے
بلکہ تیسرے اور چوتھے درجے میں شمار کرتے ہیں۔ بعض اہلِ قلم اس
مذاق کے بھی ہیں جو ادب برائے ادب کو کسی درجے میں بھی شمار
نہیں کرتے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے نزدیک ادب کی
صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ برائے ادب بھی ہو اور برائے زندگی بھی۔
گلستان بوستان میں یہ دونوں وصف امتیازی حیثیت کے ہیں۔ اس
کے علاوہ ان کے مضامین کی عمارت زندگی بھر کے تجربات اور
چشم دید واقعات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ لیعنی ان میں حقائق

ہی حقائق ہیں۔ ان میں کوئی بیان ایسا نظر نہیں۔ جسے محض خیال بندی یا لفظوں کا طلسمی قلعہ کہا جا سکے۔ گلستان اگرچہ نثر میں ہے مگر اس کی نثر میں بھی شاعری کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کوئی مقام ایسا نظر نہیں آئے گا۔ جو شاعرانہ حسن بیان سے محروم ہو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک۔ تو کہ چراغ نہ بینی بہ چراغ چہ بینی۔ خواہند برسید کہ ہنر چیست و نخواہد پرسید کہ پدرت کیست۔ اے مردان بکوشید تا جامہ زنان نہ پوشید۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ ہنوز چشمش نگران است کہ ملکش بادگران است۔ توانگری بدل است نہ بمال و بزرگی بہ عقل است نہ بہ مال ہر چہ قامت بہتر بہ قیمت بہتر۔

یہ مثالیں اگرچہ مقفٰے ہیں مگر اس کے باوجود بالکل بے ساختہ ہیں۔ تصنع اور آورد کی کوئی آمیزش ان میں نہیں۔ منشی فاضل کے امتحان میں ایک پرچہ فارسی مضمون نویسی کا بھی ہوتا ہے۔ جب کبھی کسی اُمیدوار نے اس پرچے کے متعلق مضمون نویسی کا معیار مجھ سے پوچھا ہے تو میں نے ہمیشہ گلستان ہی کی نثر کو فاضلانہ انشاء پردازی کا صحیح نمونہ بتایا ہے۔ اس نثر میں سادگی اور سلاست کے باوجود کوئی حکایت ایسی نہیں جو بے کیف ہو یا اس میں شاعرانہ انداز نہ پایا جائے۔ سچ پوچھو تو کامیاب اور مقبول نثر وہی ہوتی ہے۔ جس میں حقیقت نگاری اور شاعرانہ حسن بیان دونوں اوصاف بہت نمایاں ہوں۔ جو نثر ان دونوں اوصاف میں کسی وصف سے تہی دامن ہے وہ قالب بے روح ہے۔

بلند پایہ اصول جو میں نے ابھی گذارش کیا ہے۔ اِسی اُصول کی بنا پر میں بوستان کو بھی بہترین ادب سمجھتا ہوں۔ پند و نصائح جیسے خشک مضمون میں اتنی تر زبانی جو بوستان میں ہے اور کسی کتاب میں نہ ملے گی۔

فارسی غزل میں دل کشی اور تاثیر کلام کے لحاظ سے میں دیوان سعدیؔ اور دیوان حافظؔ کو قصاید میں دریا کی سی روانی کے لحاظ سے قصاید۔ قاآنی کو ہمیشہ حاصل ادب خیال کیا ہے۔ ادب کے دونوں اوصاف ان میں بھی بہت وقیع ہیں۔

اُردو ادب اور فن شعر کی جن کتابوں نے سب سے زیادہ رہنمائی کی ہے۔ ان کو نفسِ مضمون کے لحاظ سے مختلف حصّوں میں بیان کرنا مناسب ہوگا۔ سب سے پہلے ادبی رنگ میں نثر کی عام کتابیں ہیں۔ افسانہ نگاری اور ڈرامے کی طرف میں نے شروع ہی سے توجہ نہیں کی۔ مگر پھر بھی میں شاعرانہ مذاق کی نثر نگاری اور بیان کی رنگینی و دل آویزی کے لحاظ سے فسانہ آزاد کو باوجود اس بات کہ اس کا سلسلہ بیان بے ربط بھی ہے اور خیالی بھی۔ ادبی ذوق کی نشو و نما کے لیے بہترین تصنیف کہوں گا۔ اگرچہ منشی پریم چند اور سدرشن کے متعدد افسانے میں نے پڑھے ہیں مگر جس چیز کا میں دلدادہ ہوں وہ ان میں بھی نہیں۔ ان مشاہیر نے قلم کا پُورا زور صرف حقیقت نگاری اور فطری جذبات کی ترجمانی پر صرف کر دیا ہے۔ شاعرانہ ذوق کی پرورش کے لیے نثر کی تین ہی کتابوں کو ترجیح دے سکتا ہوں۔ ایک تو یہی فسانۂ آزاد دوسرے نیرنگ خیال جس کے مصنف

مولانا آزاد مرحوم کو ان کی اعجاز بیانی پر نثر کا پیغمبر کہنا چاہیے۔ تیسرے اُردو معلّےٰ جس میں صحت زبان کے علاوہ مراسلت نگاری کی ایک نئی دُنیا آباد نظر آتی ہے۔ رسل و رسائل کے میدان میں اور کوئی کتاب اُردو معلےٰ کے مدمقابل نہیں ہے۔ انداز بیان کی دل کشی اور بے تکلفی کے ساتھ ساتھ اس نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سینکڑوں کوس دُور بیٹھے ہوئے کاتب اور مکتوب الیہ بالمشافہ گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے ادیبوں نے اس قسم کی نثر لکھنے میں تقلید کی کوشش کی ہے مگر یہ کوشش اس نثر کے مقابلے میں اصل اور نقل یا رُوپ اور بہروپ کے فرق سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اگرچہ ان خطوط کی عمر سو سال کے قریب ہو چکی ہے۔ مگر مراسلت نگاری کے محدود دائرے میں اب بھی جب کہ اُردو کی انشاپردازی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے یہ طرز نگارش عظیم المثال ہے۔

دوسرے حصّے میں ان کتابوں کے نام سنیئے جو فنِ تنقید میں میری رہنمائی کرتی رہی ہیں۔ اور اسی رہنمائی کے زیر اثر میں نے بھی مشاہیر کے کلام پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ نقد و تبصرہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے صحیح ذوق کا مفہوم کیا ہے۔ نبّاضِ سخن شعر کی رگ رگ کی جانچ کس طرح کرتا ہے یہ بات آبِ حیات یادگارِ غالب اور مقدمہ حالی ہی نے مجھ پر واضح کی ہے۔ اگرچہ ہر تذکرہ نگار اور ہر نقاد نے اپنی بساط کے مطابق شعر کے باریک اور نازک نکات پر بہت کچھ لکھا ہے اور وہ اپنی جگہ قابل قدر بھی ہے۔ مگر تنقید کی جو شان ان تینوں میں پائی جاتی ہے وہ بہت گراں قدر اور گراں ارز ہے۔

تیسرا نمبر زبان کی تحقیقات کا ہے۔ اس ضمن میں فارسی زبان کے متعلق تو میں نے سخن دانِ پارس اور شعر العجم کو بہت مفید پایا ہے اور اُردو کے متعلق آب حیات کے ابتدائی حصّے کو جسے اس کتاب کا مقدمہ کہنا چاہیے۔

چوتھے نمبر میں لغت کی کتابیں ہیں۔ فرہنگ بھی زبان کی تحقیقات سے چولی دامن کا ساتھ رکھتی ہے اگرچہ اس موضوع پر بحث کرنے والی بڑی بڑی ضخیم کتابیں اُردو فارسی میں آپ کی نظر سے گذری ہوں گی مگر میں نے فارسی میں یا تو غیاث اللغات کو اس بنا پر کہ صحیح تلفظ بتا دینے کے علاوہ اس کا بیان بہت سی مستند فرہنگوں کا نچوڑ ہے۔ یا منشی ٹیک چند بہار کی تالیف بہار عجم کو اس بنا پر کہ اس میں لفظ اور محاورہ کا استعمال اور اس کی سند بھی ثقات شعراء کے کلام سے دی گئی ہے۔ ہمیشہ معتبر اور اپنا رہبر خیال کیا ہے۔ اُردو میں فرہنگ آصفیہ میرے نزدیک بہت افادی حیثیت رکھتی ہے۔ متنازعہ فیہ امور کے لیے اس کا بیان قول فیصل سے کم نہیں ہوتا۔

پانچویں نمبر میں علم بیان۔ علم معانی اور علم عروض کو لیجیے۔ اس ضمن میں قابل اعتماد کتب کے نام اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں بحر الفصاحت اور حدائق البلاغت ہی عرض کروں گا۔ اگرچہ ان کتب میں قافیہ اور ردیف کی بحث کے متعلق بیانات بہت مختصر ہیں۔ اور جو کچھ ہیں ان پر بھی فارسی زبان چھائی ہوئی ہے۔ ایطا کی بحث میں مثالیں فارسی ہی کی آپ کو ملیں گی۔ لگانا اور بجھانا کے قوافی میں جو سقم ہے۔ یا چمن اور انجمن کے قوافی میں جو خرابی ہے۔ اس کے متعلق بھی یہ

کتابیں خاموش ہیں۔ حدائق البلاغت تو خیر فارسی زبان میں ہے۔ اس میں اُردو قوافی کا مذکور ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر تعجب ہے کہ بحر الفصاحت میں بھی جو اردو ادب ہی کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اُردو قوافی کی بحث کو کیوں مفصل اور جامع طور پر بیان کیا گیا ہے اس کمی کے باوجود بھی دونوں کتابیں ضروریات شعری میں بہت کچھ رہنمائی کرتی رہی ہیں۔

چھٹا نمبر متروکات زبان اور متروکات شعری کا ہے۔ اگرچہ بہت سے مشاہیر نے مجموعہ کلام کے ساتھ ان کی فہرست شامل کی ہے۔ اور اس موضوع پر کام کی باتیں کہی ہیں۔ مگر میں ان سب پر دستور الفصحا مصنفہ کمال لکھنوی جس کا ہر ایک نکتہ حضرت جلال لکھنوی کی تائید کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ بہت جامع بہت واضح اور بہت معتبر خیال کرتا ہوں۔ اس خاص موضوع پر یہ کتاب زبان کے طالب علم کو صحت زبان کے متعلق اتنا کچھ بتاتی ہے کہ اس سے زیادہ مکمل بحث اور کسی کتاب میں نہ ملے گی۔

ساتویں نمبر میں اُردو ادب کا وہ حصہ ہے۔ جسے عرف عام میں نظم کہا جاتا ہے۔ میں شروع ہی سے ایسے کلام کو زیادہ پسند کرتا رہا ہوں جس میں تخیل اور اُردو زبان دوش بدوش ہوں۔ دیوان غالب کو میں اس لئے اپنا رہبر سمجھتا ہوں کہ اس میں تخیل کی پرواز تو بہت زیادہ اور بہت بلند ہے مگر زبان میں فارسیت کی بھرمار ہے۔ اس طرح بعض شعراء نے تخیل کو بالائے طاق رکھ کر صرف زبان ہی زبان پر توجہ مبذول کی ہے مثلاً

تمہیں چاہو تمہیں چاہو تمہیں چاہو رقیبوں کو
کبھی ہم نے چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

بعض اساتذہ کو آپ لفظی اور معنوی تکلفات کی رو میں بہتے دیکھیں گے۔ انہوں نے معنی آفرینی وجدت آرائی کے جنون میں نہ تو اظہار حقیقت کی پرواکی نہ جذبات نگاری کی۔ مثلاً امیر مینائی کا یہ شعر۔

میں وہ غم دوست ہوں تجویز کی غم سے دوا غم کی
جو آیا منہ چھپالی چھالیں نے نخلِ ماتم کی

یا مومن کا یہ شعر ———

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمعِ شبستاں ہوں گے

یا غالب کا یہ شعر ———

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

چونکہ ان اشعار میں بہ جز خیال بندی اور غرابت بیان کے اور کوئی روح جسے شعریت کہا جاتا ہے موجود نہیں۔ اس لیے طبیعت ادھر کیوں ملتفت ہوتی۔ اس قسم پیچیدہ بیانی کو تو معمہ گوئی ہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے یا ہوائی قلعوں سے۔ ابتدائی مشق کے دوران میں جس کلام کو میں نے اپنے میلانِ طبیعت کے مطابق پایا وہ دیوانِ ذوق تھا۔ اس میں تخیل اور زبان دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے۔ اسی دیوان نے یہ بتایا کہ حسن بندش کیا ہوتا ہے اور ہموار شعر کسے کہتے ہیں۔ محاورات استعمال میں ایسے نادر اسلوب کہ ان سے بہتر خیال میں نہ آسکیں۔ اسی

دیوان میں دیکھے۔ اس کے بعد حضرت داغؔ کے دیوان گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ۔ اور ان کی مثنوی فریاد داغ خضر راہ ثابت ہوئے۔ بیان کی سلاست بندش کی اصلیت جدت ادا نئے نئے انداز نئے نئے اسلوب راز و نیاز کی باتیں محبت کی گھاتیں معاملہ بندی جذبات کی ترجمانی۔ شعر پڑھا اور دل میں اترا۔ قافیے کا حسن اور اس کی برجستگی اور شگفتگی ردیف کی نشست اور قافیے کے ساتھ اس کا دست و گریباں ہونا۔ سانچے میں ڈھلے ہوئے مصرعے ٹکسالی زبان کا لطف اور اس کی حلاوت۔ غرض ہر ایک بات اپنے ذوق طبیعت کے مطابق پائی۔ اور ان سے وہ کچھ سیکھا جو اور کہیں حاصل نہ ہو سکا۔ شوخی میں متانت اور متانت میں شوخی سادگی میں رنگینی اور رنگینی میں سادگی دیکھی۔ اس بحث کو چھوڑیے کہ شاعر نے کیا کہا۔ یہ دیکھیے۔ کیا کہا کس ادا اور کس ٹھاٹھ سے کہا۔ داغ ہی کے شہر آشوب نے یہ سمجھایا کہ کسی خاص عنوان کے ماتحت نظم بھی وہی کامیاب اور جاذب نظر ہوتی ہے۔ جس کے ہر شعر میں انداز بیان غزل کا ہی ہو۔ ورنہ وہ بالکل بے کیف اور محض قافیہ پیمائی ہوگی۔ آہوں کی تعریف میں بھی جو کچھ انہوں نے کہا اس نے بھی یہی نکتہ ذہن نشین کیا کہ اچھی اور معیاری نظم وہی ہوتی ہے جس کا ہر شعر غزل ہی کے انداز بیان میں ڈوبا ہوا ہے۔ ورنہ اس کا کہنا سعی لاحاصل ہے۔ اس نظریہ کی تائید مولانا حالیؔ کے اس مرثیے سے بھی ہوتی ہے جو موصوف نے مرزا غالبؔ کی وفات پر تصنیف کیا یا اقبالؔ نے حضرت داغؔ کی وفات پر کہا۔ پس

غزل ہو یا نظم مسدس ہو یا مخمس رباعی ہو یا قطعہ میں تو اسی طرز نگارش کو سب سے بہتر اور قابل تقلید نمونہ سمجھتا ہوں اور جب تک زندگی ہے۔ اسی انداز سخن کو رہنمائے کامل سمجھتا رہوں گا۔

٭ ٭ ٭